مسلم پرسنل لاء

یا

اسلامک لاء؟

از نتیجۂ فکر: رئیس المحققین شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی

ناشر

المیزان پبلیکیشنز

دارالعلوم دیوان شاہ، درگاہ روڈ،
بھیونڈی-۴۲۱۳۰۲ ضلع تھانے؛ مہاراشٹر

اشاعت ۱

کتاب ——— مسلم پرسنل لا ریا اسلامک لاء

مصنف ——— شیخ الاسلام سید محمد مدنی اشرفی جیلانی

سن ——— نومبر ۱۹۸۵ء

تعداد ——— ۵ ہزار

کاتب ——— شریف احمد میواتی

تزئین کار ——— تحسین آرٹ

مطبوعہ ——— نیو پبلک پریس لال کنواں دہلی ۶

ناشر ——— المیزان پبلی کیشنز

قیمت ——— پانچ روپے

کتاب طلب کرنے کا پتہ

منیجر المیزان پبلیکیشنز

دار العلوم دیوان شاہ۔ درگاہ روڈ

بھیونڈی 421302 ضلع تھانے۔ مہاراشٹرہ

فون 7762

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلین

جیلانی میاں

ہندوستان جیسے سیکولر اسٹیٹ کے لئے جو مختلف مذاہب اور قوموں کا گھوارہ ہے، آزادی کے بعد ہی دستوری طور پر فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مکمل آزادی حاصل رہے گی اور ملک میں ایک جمہوری اور غیر مذہبی حکومت قائم رہے گی۔

لیکن ہم جب آزادی کے ۳۷ برسوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں دکھ ہوتا ہے کہ ہندوستانی دستور کے مطابق منتخبہ حکومت کو جب مسلمانوں کے تئیں کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو لیت ولعل سے کام لیتی ہے یہ ایک رواج سا ہو گیا ہے، عادت سی بن گئی ہے۔ کوئی بھی حکومت ہو نہرو سے لے کر اندرا گاندھی تک۔ مرار جی سے لے کر راجیو گاندھی تک ——— ہر حکومت ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت اور دنیا کی دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی کے مسائل کے حل میں "سرد مہری" کا برتاؤ کرتی رہی ہے۔ ہاں جب خود حکومت کی راہ میں کوئی رکاوٹ آئی، نظم ونسق کے نام پر یا ملکی سالمیت کے نام پر یا خود اپنی حکومت کے استحکام کے نام پر دستور ہند ہو یا سپریم کورٹ کا فیصلہ۔ بڑی عجلت اور تیزردی کے ساتھ ترمیم کی گئی۔ رکاوٹیں دور کی گئیں۔ مسائل حل کئے گئے۔ لیکن مسلم مسائل کے لئے تغافل وتجاہل کی ایک لمبی داستان ہے۔ سرسری جائزہ ملاحظہ ہو۔

اردو: آزادی کے بعد سے اردو کی سرکاری حیثیت حل طلب ہے، اور اب تو حال یہ ہے کہ ہماری ایک پوری نسل جوان ہو چکی ہے جو اردو سے قطعی نابلد ہے۔ لہٰذا شائد حکومت کی منشا بھی پوری ہو چکی ہے اس لئے اب اردو کے لیے وہ سرگرمی نہیں نظر آتی جو ۱۵-۲۰ سال پہلے تھی۔ اردو نسل ہی بوڑھی ہوتی جارہی ہے۔

مسلم یونیورسٹی: پہلے مشکلات اختراع کیجئے۔ حالات کو سنگین بنایئے پھر کچھ دیدیجئے۔ یہی سلوک حکومت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ کیا۔ اور اب تو جیسے ۹.۴.۸۱ کو نظر لگ گئی ہو کہ۔ اب تک کوئی۔ ناخدا نہ مل سکا اللہ رحم کرے۔

فسادات: مسلمانوں کے یے معمول بن گئے ہیں۔ آگ وخون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ جان و مال وعزت سب لوٹ لیا جاتا ہے جو کچھ کسر رہ جاتی ہے وہ جیل، مقدمات اور سزا سے پوری کردی جاتی ہے۔ تھپکی کے بیانات، دلاسے، قومی ایکتا کے جلسے عارضی ریلیف تحقیقاتی کمیشن کا تقرر اسکی رپورٹ "سردخانے"

کی نذر ۔ اور بس سرکاری ملازمتوں میں سوتیلا سلوک، تجارت وصنعت میں دوسرے درجے کا رویہ تعلیمی اداروں کا قیام عصبیت کا شکار ۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور مسلمان سہتا رہا ہے ۔ اور ایک باوقار شہری، محب وطن اور قوم پرور کی حیثیت سے ہندوستان میں جیتا رہا ہے ۔ اور جب کبھی بھی ملک و وطن کو خطرہ لاحق ہوا مسلمان نے اپنے ہندوستان کو دوسروں کے ہاتھوں بیچنے کی بجائے ہندوستان کو بچانے کے لئے اپنی جان قربان کردی ______

سپریم کورٹ کا فیصلہ ۔ اسلامیان ہند کا کرب

۳۷ سال کے ان مصائب و آلام کو مسلمان جھیلتا رہا ۔ اور اپنے تشخص دینی کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملک کی معاشی اقتصادی، تعلیمی تہذیبی اور سلامتی کے میدان میں اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی ادا کرتا رہے گا ______ لیکن ادھر چند سال سے ہندی مسلمان یہ دیکھ رہا ہے کہ اسکے دینی امور میں نگاہ غلط ڈالی جارہی ہے، اور یہ سب جن سنگھ، آر ایس ایس، ہندو سینا، ہندو پریشد، شیوسینا جیسی فرقہ پرست جماعتوں کی جانب سے نہیں بلکہ ہندوستان کی عدلیہ کے پیدا کردہ نتائج ہیں جن سے مسلمان انتہائی کرب و تشویش میں دن گزار رہے ہیں ۔ حالیہ سپریم کورٹ کے فیصلے نے جس میں ایک مسلم عورت (شاہ بانو) کو مظلوم بناکر پوری اسلامی شریعت کو ظالم بنا ڈالا ۔ اسلامیان ہند کے لئے قطعی ناقابل قبول ہے ______ آنریبل سپریم کورٹ کا مذکورہ بالا فیصلہ شریعت اسلامیہ میں کھلی مداخلت ہے ______ جس کی بنیاد ۱۹۷۳ء میں پارلیمنٹ کے ذریعہ دفعہ ۱۲۵ کی منظوری کے وقت ڈالدی گئی تھی ______ اس وقت آل انڈیا سنی لیگ بمبئی نے (۱۹۸۴ء میں) سخت احتجاج کیا تھا اور اکابرین ملت کو آئندہ خطرہ سے آگہی دی تھی ۔ جو صد ابصحرا ثابت ہوئی اب جبکہ سپریم کورٹ کا فیصلہ آگیا ۔ یعنی پانی سر سے اوپر ہوگیا تو سبھی اٹھ کھڑے ہو گئے ۔ بات چونکہ شریعت اسلامیہ کے تحفظ کی ہے اور مزید ظلم یہ کہ سپریم کورٹ نے کامن لا کے نفاذ کا بھی شدید اصرار کر ڈالا ہے ۔ لہٰذا فطری طور پر وہ قوم ضرور بے چین ہو اٹھے گی جس کے پاس ایک مکمل دین فطرت ہے، کامل ضابطۂ حیات ہے ۔ رب تعالیٰ کا بھیجا ہوا اور رسول اعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نافذ کیا ہوا اسلام ہے ۔ اس لئے رئیس المحققین شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی کچھوچھوی (جانشین حضرت محدث اعظم ہند) نے جہاں اسلام اور قانون اسلامی، طلاق کے تمام مسائل، قرآن وحدیث، اجماع وقیاس کے دلائل ۔ فقہاء کرام وائمہ کرام کی تحقیقات کو پورے شرح وبسط کے ساتھ دل نشین اور اچھوتے انداز میں تحریر کیا ہے ۔ وہیں کچھ سوالیہ نشانات بھی کھینچے ہیں ۔

مسلم پرسنل لا بورڈ اور پوری ملت کیلئے لمحہ فکریہ

شیخ الاسلام نے "مسلم پرسنل لا" کی اصطلاح ہی کو لغو اور جہالت سے تعبیر کیا ہے اور باضابطہ دلائل سے مبرھن کیا ہے، جو ہم سب کے لئے علماء کرام کے لئے سیاسی قائدین خصوصاً مسلم پرسنل لا بورڈ

کے موجودہ ذمہ داروں کے لئے لمحہ فکریہ ہے ۱۹۳۷ء میں جس غلطی کا آغاز ہوا تھا ابھی بھی وقت ہے کہ اسے سدھار لیا جائے ۔ اب جبکہ ہم سنجیدہ فکر راجیو گاندھی کی قیادت سے دفعہ ۱۲۵ دفعہ ۴۴ وغیرہ میں ترمیم واستشنار کا مطالبہ کررہے ہیں ۔ وہیں حکومت کو یہ بھی باور کرادیں کہ ہم مسلمانوں کا کوئی بھی پرسنل لا یا ذاتی قانون نہیں ہے، ہم مسلمانوں کے پاس جو بھی قانون ہے وہ قانون الٰہی ہے وہ اسلامی لا ہے وہ آسمانی قانون ہے وہ ہمارا ذاتی قانون (مسلم پرسنل لا) نہیں ہے ۔ تاکہ مستقبل میں کسی حکومت کو یہ اعلان کرنے کا موقع نہ ملے کہ جب مسلمان چاہیں گے تب حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا یعنی ذاتی قانون میں ترمیم کرے گی ______ اگر غور کیجئے تو ۱۹۳۷ء میں انگریزوں نے شریعت ایکٹ ختم کرکے مسلم پرسنل لا کی اصطلاح اسی لئے اختراع کرکے ایک سوراخ بنادیا تھا کہ کل کوئی بھی حکومت شریعت اسلامیہ کو اس سوراخ سے ڈس سکے ______ ابھی سویرا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے مطالبے میں یہ بھی شامل کرے کہ حکومت دستور ہند میں مسلم پرسنل لا کی غیر شرعی اصطلاح کو ختم کرکے "اسلامک لا" کی فطری اور شرعی اصطلاح شامل کرے ۔ اس سے پہلے خود مسلم پرسنل بورڈ بھی اسلامک لا بورڈ کی اصطلاح کو اختیار کرے ______ ہم نے اس کتاب کا نام اسی مناسبت سے مسلم پرسنل لا یا اسلامک لا رکھا ہے ۔ شیخ الاسلام نے اس کتاب میں طلاق نان نفقہ اور اسلامی عائلی قوانین پر تمام ضروری اہم اور دستاویزی معلومات کو جمع کرکے جو تحقیق ونتیجہ پیش فرمایا ہے ۔ آپ مطالعہ کرکے پکار اٹھیں گے کہ کوزے میں دریا سمو دیا گیا ہے "مسلم پرسنل لا یا اسلامک لا" آپ کو اس موضوع پر لکھی گئی ڈھیر ساری کتابوں سے بے نیاز کردے گی ۔ المیزان پبلی کیشنز کی تاریخ ساز اشاعت کو قارئین ضرور پسند فرمائیں گے ۔ خیراندیش

سید محمد جیلانی میاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی

قومی پرچم کی سہ رنگی اور مسلم اقلیت

کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی اساس کسی دین و مذہب پر نہیں رکھی گئی ہے۔ یہاں کسی مذہب کو سرکاری مذہب کی حیثیت نہیں حاصل ہے۔ اس سیکولر اسٹیٹ (لادینی نظام حکومت) کے لازمی فرائض میں سے ہے کہ وہ کسی کے بھی دین و مذہب میں ذرہ برابر مداخلت نہ کرے اور ہر ایک ہندوستانی کو اپنے اپنے دین و مذہب کے اصولوں کے سایے میں پورے اطمینان و سکون کے ساتھ جینے دے۔ نزاعی حالات پیدا ہونے کی صورت میں ہر شخص کا فیصلہ خود اسی کے دین و مذہب کی ہدایات کی روشنی میں کرے ـــــ لیکن دیکھا یہ جاتا ہے ـــــ کہ ـــ ارباب اقتدار مسلسل سیکولرزم کے چہرے پر طمانچے پر طمانچہ لگاتے جا رہے ہیں اور اب تک اتنا لگا چکے ہیں کہ اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دیو استبداد کو سر سے پیر تک جمہوری قبا میں ملبوس کر دیا گیا ہو اور اسی کا نام سیکولرزم رکھ کر وقت کا سب سے بڑا جھوٹ بولا گیا ہو اور اس طرح ایک نہایت ہی انسانیت سوز بہیمت آثار اور گھناؤنے فریب کی پرورش کی جا رہی ہو؟ ـــــ

یہ صحیح ہے کہ پردے کا کام پردہ پوشی ہے مگر اب تو اس ظاہری لباس کی بھی تو دھجیاں اڑتی نظر آ رہی ہیں اور اگر یہی حال رہا تو کچھ تعجب نہیں کہ جمہوری قبا اتنی تار تار ہو جائے کہ اس کے پیچھے چھپنے والے کی بھیانک صورت دور ہی سے نظر آنے لگے ـــــــــ ہندوستان کے قومی پرچم کی

سہ رنگی ہندوستان میں بسنے والوں کی مختلف فکر و نظر اور ان کی مختلف رنگ و روپ رکھنے والی تہذیبوں کی نشاندہی کر رہی ہے ـــ ایسی صورت میں ـــ قومی پرچم کی سہ رنگی کو یک رنگی میں تبدیل کئے بغیر ہندوستانیوں کی مختلف تہذیبوں کو ایک تہذیب کے سانچے میں ڈھال دینے کی جد و جہد کرنی نیز مختلف دین و مذہب رکھنے والوں کو ایک ہی مذہب کا پابند کر دینے کی کوشش کرنی سیکولرزم کی اساس پر تشکیل کئے جانے والے دستور ہند کے ساتھ کس قدر ظالمانہ سلوک ہوگا۔

فساد فی الارض کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے

اس ملک میں بسنے والی دوسری اقلیتیں دکھ درد اور کرب و اضطراب کے کن مرحلوں سے گزر رہی ہیں اور ان کو مذہبی اور سیاسی حیثیت سے کن مسائل سے دو چار ہونا پڑ رہا ہے اس وقت یہ میرا موضوع نہیں ہے ـــــــــ اس تعلق سے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے انہی اقلیتوں کے دانشوروں سے رابطہ قائم کرنا نتیجہ خیز ہو سکتا ہے ـــ چونکہ ـــ میں اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا فرد ہوں تو مجھے اپنے زخموں کا مشاہدہ کرانا دوسروں کے ذہن و فکر اور روح و تن کی خراشوں کو دکھانے سے زیادہ آسان ہے ـــ کہیں کوئی یہ خیال نہ کرنے لگے کہ میں اس سیکولرزم کے داعی و حامی ملک میں ہونے والے بے شمار فرقہ وارانہ فسادات کی (جس کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں کیا جا سکا) خونچکاں داستانوں سے صفحات قرطاس کو لالہ زار بنا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں ـــــــ نہیں ایسا میرا کوئی ارادہ نہیں اس لئے کہ فسادات کی وجہ سے ہونے والی بے شمار بیواؤں کی چیخ و پکار اور لاتعداد یتیموں اور مظلوموں کی آہ و واویلا کون ہے جس کے کانوں تک نہیں پہنچی جلتے ہوئے مکانوں اور دوکانوں کے فلک بوس شعلوں کی حرارت کون ہے جس کے دامن تک نہ پہنچی ہو ـــــ فسادات وہ بھی ملک کے نوجوان محافظوں اور مسلح پاسبانوں کی سرپرستی میں اور ان کے بھرپور تعاون سے اس ملک کا مقدر بن چکے ہیں ہر کوئی جن سے اچھی طرح واقف ہے ـــ لہٰذا ـــ ضرورت نہیں رہ گئی کہ اب جمشید پور، راوڑکیلا، مرادآباد، میرٹھ، احمدآباد اور بھیونڈی حیدرآباد کی تاریخ دہرائی جائے ـــــ فرقہ وارانہ فسادات کہیں بھی ہوں وہ ہر انسانی اقدار، شرافت نفسی اور عظیم کردار رکھنے والوں کے رنج و ملال اور دکھ درد کا باعث ہوتے ہیں خواہ یہ

کہیں بھی رہتے ہوں ـــــ مگر ـــ اِن فسادات کے سنگین نتائج کا راست سامنا انھیں کو کرنا پڑتا ہے جو اس فساد زدہ علاقے سے وابستہ و ہم رشتہ ہیں ـــ لیکن ـ اسی ہندوستان کی دھرتی پر اس آکاش کے تلے ایک ایسے فساد فی الارض کی داغ بیل بھی ڈال دی گئی ہے دھرتی پر بسنے والا ہر باشعور اور دردمند دِل رکھنے والا ہر انسان جس کی لپیٹ میں ہے۔ ایسا فساد جس پر اگر ایک طرف دھرتی سوگوار ہو تو دوسری طرف آسمان خون کے آنسو بہا رہا ہو ـــ آج میں اُسی فساد فی الارض کی طرف اربابِ انصاف اور اصحابِ فکر و نظر کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ـــ

یہ وہ فساد ہے جس کا نشانہ جسم نہیں ہے بلکہ روح ہے یہ قالب کو تو مجروح نہیں کرتا مگر قلب کو چھلنی کر دیتا ہے ـ یہ فساد کسی بچے کو یتیم، کسی خاتون کو بیوہ، کسی گھر والے کو بے گھر، کسی امیر کو غریب کسی صاحب اختیار کو محتاج تو نہیں بناتا ـــ مگر ـــ ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ بچے باپ رکھ کر بھی اپنے کو بے سایہ، خواتین شوہر رکھتے ہوئے بھی اپنے کو بے سہارا، گھر والے گھر میں رہ کر بھی اپنے کو بے مسکنی کا شکار، اُمراء دولت کی ریل پیل کی موجودگی میں بھی اپنے کو غربت و افلاس کا مارا، اور صاحبانِ اختیار مختار ہونے کی صورت میں بھی اپنے کو مجبور باور کرنے لگتے ہیں۔ اس فساد سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں جس کا دائرہ اثر کسی ایک بستی اور کسی ایک ماحول تک محدود نہیں ـــ اس فساد کے دائرہ اثر کو نہ تو پیمانۂ امروز و فردا سے ناپا جا سکتا ہے اور نہ اسے سنگ و میل کی مخصوص قید و بند میں رکھا جا سکتا ہے ـــ اس فساد کا مختصر سا نام ہے "مداخلت فی الدّین" ـــ ہر دین و مذہب والے کو اپنے دین و مذہب سے جو محبت ہوتی ہے اس کے سامنے جان و تن اور مال و اولاد کی محبت کا کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔ دین و مذہب کی بقا اور اس کے تحفّظ کے لئے عزیز سے عزیز ترین شے کو قربان کر دینا ایک آسان ترین امَر سمجھا جاتا ہے اور ایثار و قربانی کرنے والا مر کر بھی زندہ جاوید بن جاتا ہے ـــ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ کسی بھی دین و مذہب پر ظالمانہ یورش دنیا کے کسی خطّے میں بھی ہو لیکن اس کا نشانہ ہر وہ انسان ہوتا ہے جو اس دین کا ماننے والا ہو خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشے میں بھی رہتا ہو، کسی بھی سن و سال کا ہو، کوئی بھی صنف رکھتا ہو، کوئی بھی رنگ و روپ والا ہو اور کیسی ہی زبان بولتا ہو ـــ دین و مذہب کے ساتھ انسانوں کا

یہی لگاؤ ہے جس کی وجہ سے کوئی انسان اپنے دین و مذہب کی پیشانی پر بل آنے نہیں دیتا اب اگر کہیں بھی کسی کے مذہب میں بے جا مداخلت کی گئی تو صرف اسی خاص علاقے کے لوگ ہی نہیں بلکہ اس دین و مذہب کی کائنات میں بسنے والا ہر شخص چیخ اٹھتا ہے اور ہر طرف سے دفاعی محاذ آرائیوں کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور دین بچانے کے لئے ہر اٹھنے والا اس حوصلے سے اٹھتا ہے کہ اس کو اپنی تباہی و بربادی، اپنے بچّوں کی یتیمی اور اپنی بیویوں کی بیوگی میں بھی ایک خاص نوعیت کی دِل کشی نظر آنے لگتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس رزمگاہ اخلاص میں اس کے بچّے اور اس کی عورتیں خود اس پر بھی سبقت لے جاتی ہیں ـــــ دین و مذہب کا نشہ ایک ایسا نشہ ہے تختہ دار پر بھی جس کے سُرور میں کمی نہیں آتی بلکہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے ـــــ اس مختصر سی وضاحت سے ظاہر ہو گیا کہ فساد فی الارض کی وہ صورت جو مداخلت فی الدّین کے نتیجے میں رونُما ہوتی ہے بڑی ہی سنگین ہے دوسرے فسادات اس کے پاسنگ کا بھی درجہ نہیں رکھتے ـــ اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اُس ملک میں امن و امان، سلامتی و شانتی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جہاں کے اربابِ اقتدار مداخلت فی الدّین کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خونی معرکہ، چیخ و پکار اور آہ و واویلا کو اپنی سب سے بہترین تفریح سمجھتے ہوں ـــــ نیز ـــ اسے اپنی سیاسی و انتظامی تمام تر بے صلاحیتوں اور نا اہلیوں کی پردہ پوشی کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے ہوں۔

حب الوطنی کے چراغ

ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں جن کا ہندوستان کی سرزمین سے تعلّق اپنے دوسرے برادرانِ وطن کی طرح ایک قدیم ترین تعلّق ہے اور جو اس سرزمین کو برطانوی اقتدار سے آزاد کرانے میں تن من دھن ہر طرح سے اپنے برادرانِ وطن کے دوش بدوش رہے۔ نیز ـــ جنھوں نے اس سرزمین کو اگر ایک طرف اسلامی انوار و برکات سے مالامال فرما دیا تو دوسری طرف اخلاقی قدروں کی ایسی شمعیں فروزاں کیں جن کی کرنیں آج بھی ظلمت کدہ دِل کو منوّر و مجلّی فرما رہی ہیں ـــ نیز ـــ اس سرزمین کو ایسے تہذیبی نشانات سے معمور کر دیا ہے جس نے اُسے جنّت نشان بنا دیا ہے۔ وقت آنے پر اپنی جانیں قربان

کردیں مگر حب الوطنی کے چراغ کو گل ہونے نہیں دیا ——— یہ مسلمان بھی ایک دین رکھتے ہیں جس کو اسلام کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے اسلام درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کا ایک یقینی ذریعہ ہے بلکہ خدا کو راضی کرنے کا بس صرف یہی ایک ذریعہ ہے اس کے سوا دوسرے ذرائع ہلاکت میں لے جانے والے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خدا کی رضا و خوشنودی کے بغیر دارین کی صلاح و فلاح اور سعادت و نجات کا تصوّر بھی محالاتِ خرد سے ہے ——— ویسے تو اسلام کے سوا دوسرے ادیان کے ماننے والے بھی اپنے خیالی یا حقیقی رب کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالب ہیں۔ لیکن — اپنے خود ساختہ اور اختراعی اصولوں سے — اس کے برخلاف — دین اسلام اپنے رب کی خوشنودی خود اپنے رب ہی کے نازل فرمودہ ضابطہ و دستور اور اُسی کے ارشاد فرمودہ اصولوں سے چاہتا ہے کہ اے پروردگار تو ہی فرمادے کہ تو کس کس چیز سے راضی ہے اور کس کس چیز میں تیری ناراضگی ہے — اسی لئے — یہ کہنا صحیح ہے کہ صرف دین اسلام ہی ہے جس کے اصولوں پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی امر یقینی ہے — چونکہ ——— اسلامی اصول خالق عقل و فطرت فاطر السمٰوات والارض ہی کی طرف سے ہیں لہٰذا اس کا کوئی قانون نہ تو عقل کے خلاف ہے اور نہ ہی فطری تقاضوں کو فنا کرنے والا ہے ——— اسلام اگر ایک طرف جا بجا پُرخار وادیوں اور زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے پیچ و خم میں عقل کو ٹھوکر کھانے سے بچاتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف فطری تقاضوں کو ایک صحیح رُخ کی ہدایت فرماتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسلام عقل و فطرت کو شتر بے مہار کی طرح آزاد نہیں چھوڑ دیتا اور نہ ہی ان دونوں کا تابع ہو کر آگے قدم بڑھاتا ہے — بلکہ — دونوں کو خود اپنا تابع رکھ کر دونوں کے حسن و دلکشی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

دین کی قانون سازی

جس طرح گمراہی کے "گلی کوچے" بے شمار ہیں لیکن سچائی کی شاہراہ ایک ہی ہے اور جس طرح کسی جغرافیہ کے نقشے میں مذکور دو شہروں کے نقطوں کو ملانے والے غیر مستقیم خطوط بہت ہوتے ہیں لیکن خط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے — یوں — بنی نوع انسان کے لئے خدائی

دین بھی ابتدا سے بلا اختلاف ایک ہی رہا ہے اور خدا کے سارے پیغمبر خواہ وہ کسی قوم، کسی عہد اور کسی ملک میں تشریف لائے ہوں اسی دین کے داعی رہے ہیں اور ہر ایک نے آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق فرمائی ہے — المختصر — خدا کی بات ازل سے ایک ہی چلی آرہی ہے اور اس کے رسولوں نے بھی روزِ اوّل سے دین کی ایک ہی سیدھی راہ دکھائی ہے۔ نہ تو خدا کی بات میں اختلاف ہو سکتا ہے اور نہ اس کے رسولوں کی راہ مختلف رہی۔ اسی حقیقت کی وضاحت اس ارشادِ ربّانی میں ہے ——— اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنَ (الانبیاء۔ع ۶) بے شک تمہارا یہ دین ایک ہی دین ہے اور میں رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو — قرآن کریم میں جگہ جگہ اسلام کو دین اللہ ارشاد فرمایا گیا ہے ——— اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ——— کیا یہ دین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور دین کی تلاش میں ہیں — وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا — اور تو دیکھے کہ لوگ دین الٰہی میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں — هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ——— وہ ذات جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ تو ہدایت و دینِ حق دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں جسے رسول کریم لے کر تشریف لائے ——— خود نبی کریم نے جو نامہ ہائے مبارک قیصرِ روم ہرقل اور مقوقس والیٔ مصر کے نام روانہ فرمائے تھے اُس میں فَاِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدَعَايَةِ الْاِسْلَامِ (میں تجھ کو دعوتِ اسلام کی طرف بُلاتا ہوں) کے کلمات مذکور ہیں۔ ——— دعایۃ الاسلام سے سرکارِ رسالت کی کیا مراد ہے اُس نامہ مبارک سے ظاہر ہو جاتی ہے جو آپ نے شاہ ایران خسرو پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں کو تحریر فرمایا تھا جس میں آپ کے کلمات یہ ہیں "ادعوك بدعاية الله عزّ وجل" میں تجھے خدائے عزّ وجل کی دعوت (دینِ الٰہی) کی طرف بلاتا ہوں۔ شاہ حبشہ حضرت نجاشی کے پاس جو مکتوب روانہ فرمایا تھا اُس کے الفاظ یہ ہیں۔ اِنّی ادعوكَ الی اللّٰه وحدہٗ لاشریكَ لهٗ والموالاة علٰی طاعته۔ کچھ آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں "وَاِنّی ادعوكَ وجنودكَ الی اللّٰهِ عزّ وجل" — میں تجھے اور تیرے لشکروں کو اللہ عزّ وجل کی طرف بلاتا ہوں — طوالتِ تحریر کا خوف نہ ہوتا تو قرآن اور حدیث سے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے بے شمار نصوص پیش کرتا کہ دین اسلام

دین الٰہی ہے اس کے جملہ اصول و قوانین خدا کی طرف سے ہیں جو کسی دنیاوی قانون ساز ادارے کی اکثریت کی رائے سے نہیں بنایا گیا۔ اس کا کوئی قانون خود اس دین کے ماننے والوں کی ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں ـــــ اسی قانون کی بُنیادی کتاب کا نام قرآن ہے جو خدا کا کلام ہے اور جس کا ایک ایک نقطہ خدا کی حفاظت کے سایے میں ہے ـــــ یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں بعض مقامات پر دین کی نسبت اس دین کے ماننے والوں کی طرف بھی کی گئی ہے۔ مثلاً ارشاد ہے: "الیوم اکملتُ لکم دینکم" آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ـــ یا ـــ جیسے کہ سرکار رسالت کی زبان سے فرمایا گیا: "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" تمہارے لئے تمہارا دین، میرے لئے میرا دین۔ یوں ہی احادیث میں بھی اس طرح کی نسبتوں کی مثالیں بہت ملیں گی ـــ مگر ـــ کسی اہل فہم پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ دین اسلام کو دین اللہ، دین الرسول اور دین المسلمین کہا تو جا سکتا ہے لیکن ہر جگہ نسبت کے وجوہ و اسباب الگ الگ ہونگے۔ ـــــ "دین اللہ" یعنی خدا کی طرف سے نازل فرمودہ دین ـــ "دین الرسول" یعنی رسول کریم کے ذریعہ بھیجا ہوا دین ـــ اور ـــ دین المسلمین یعنی مسلمانوں کا قلب کی سچائی کے ساتھ تسلیم شدہ دین ـــ تو ـــ اسلام اللہ کا بھی دین ہے اس لئے کہ خدا ہی نے اُسے نازل فرمایا ہے ـــ اور ـــ رسول کا بھی دین ہے اس لئے کہ رسول ہی اُسے لے کر آنے والے اور سمجھانے والے ہیں۔ ـ اور ـــ مسلمانوں کا بھی دین ہے اس لئے کہ مسلمان اس کے ماننے والے ہیں ـــ اس وضاحت سے بھی یہ بخوبی ظاہر ہو گیا کہ اس دین کی قانون سازی میں خود اس دین کے ماننے والوں کا کوئی ہاتھ نہیں۔

دین اصل ہے شریعتیں شاخیں ہیں

خدائی دین یعنی اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ اللہ پر ایمان لاؤ اور اسی کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۲۔ اس کے رسولوں کی تصدیق کرو اور ان کی اطاعت میں سرگرم رہو۔

۳۔ اس کی کتابوں پر ایمان لاؤ، حلال و حرام نیک و بد اور اچھے بُرے کے تعلق سے جو خدا کی ہدایات ہوں اس سے ذرہ برابر متجاوز نہ ہو اور دین میں اپنی اختراعات کو شامل نہ کرو۔

۴۔ نیک کام کرو اور کراؤ بُرے کاموں سے بچو اور بچاؤ۔

۵۔ آخرت پر یقین رکھو۔

یہی دین کا ہمیشہ دستور العمل رہا ہے جس میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہوا ـــ البتہ ـــ حالات و واقعات کے اقتضاء سے شریعتیں بدلتی رہی ہیں اور عبادات کے آداب ہر امت کے خاص خاص رہے ہیں ـــ چنانچہ ارشاد ہے: "لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" (المائدہ ع ۷) ہم نے تم سب کے لئے ایک ایک شریعت اور راستہ رکھا ہے ـ نیز ارشاد ہے: "لِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا هُمْ نَاسِکُوْہُ" (الحج، ع ۹) ہر امت کے لئے ہم نے عبادت کے خاص خاص قاعدے بنا دیے کہ وہ ان پر چلے ـــــ لیکن شریعتوں کے بدلتے رہنے اور ہر امت کی عبادت کے طریقے الگ الگ ہونے سے دین جُدا جُدا نہیں ہو گئے اس لئے کہ دین اصل (جڑ) ہے اور شرائع و مناسک اس کی شاخیں ہیں اگر درخت کی شاخیں کٹتی چھٹتی رہیں تو اس سے اس کی جڑوں کی کانٹ چھانٹ نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اپنی جگہ پر ہی رہتی ہے ـــــ آیات مذکورہ بالا میں "جعلنا" کا لفظ واضح فرما رہا ہے کہ شریعتیں بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں اور ان میں وقت ضرورت کمی و بیشی بھی اسی کی طرف سے ہے ـــ المختصر ـــ خدائے عزّ و جل نے اپنی رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے کسی انسان کو قانون سازی کی چھوٹ دی ہی نہیں ـــــ یہ بات ظاہر ہے کہ کسی کو بھی راضی کرنے کے لئے اس کے پسندیدہ امور کو اپنانا اور ناپسندیدہ امور سے اپنے کو بچائے رکھنا لازمی ہوتا ہے ـــ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی کی پسند و ناپسند کا علم فہم و ادراک سے نہیں ہو سکتا بلکہ اُسی سے معلوم کرنا پڑتا ہے کہ اُسے کیا پسند ہے؟ اور کیا ناپسند ہے؟۔ جب ایک انسان اپنی عقل سے اپنے سامنے والے انسان کی پسند و ناپسند کا ادراک نہیں کر سکتا تو پھر خدائے غیب الغیب کی پسند و ناپسند کو عقل و فراست سے سمجھنا کیوں نہ محالات سے ہو ـــ یہ تو ربِّ کریم کی نوازش ہے کہ وہ خود ہی ہر دور میں اپنی پسند و ناپسند کو انبیاء کرام کے ذریعہ واضح فرماتا رہا اور جب اُسے منظور ہوا کہ دین کو اب ایسا مکمل کر دیا جائے کہ قیامت تک اس میں کسی کمی و بیشی اور ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہی نہ ہو تو اس نے اپنے آخری پیغمبر کا انتخاب فرمایا اور ان کے ذریعہ اپنی جملہ ناپسندیدہ باتوں کی وضاحت

فرمادی نیز - اپنی پسند و ناپسند کے تعلق سے ایسے اصول وضابطے مقرر فرما دیئے کہ قیامت تک اب ان کی اساس پر جو کام کیا جائے گا وہ دین الٰہی کے دائرے سے باہر نہ ہوگا — میں اشارہ کر چکا ہوں کہ جڑ کی وحدت ہی پورے درخت کو ایک درخت کہنے کا سبب ہے۔ جڑ ایک ہے تو درخت ایک ہے خواہ اس کی شاخیں بے شمار ہوں، پھول و پھل متعدد ہوں اور پتیاں لاتعداد ہوں خواہ یہ پھول و پھل وغیرہ گذشتہ ایام کے ہوں۔ یا۔ آج کے ہوں۔ یا۔ مستقبل میں ہونے والے ہوں — مگر — جب وہ اُسی درخت کی جڑ سے وابستہ ہیں تو ان کو درخت کے مفہوم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقی قانون ساز رب تعالیٰ ہی ہے

خدائے عزّ وجل اور مخلوق خدا کے مابین رسول کی حیثیت واسطۃ الفیض کی ہوتی ہے۔ یہی وہ برزخ ہے جو خدائی احکامات کو بندوں تک پہونچاتا ہے لہٰذا خدائی احکامات کو معلوم کرنے کے لئے اور خدا تک پہونچنے کے لئے اس رسول کی ذات پر ایمان اور اس سے مستحکم رابطہ ناگزیر ہے

اور ظاہر ہے جو آخری نبی ہوگا وہ یقیناً بے شمار خصوصی صفات و کمالات کا جامع ہوگا اور بلاشبہ اس کو خالق و مخلوق کے درمیان برزخ کبریٰ کی حیثیت حاصل ہوگی اور بندوں کے لئے اس کی اطاعت و اتباع قطعی طور پر لازمی و ضروری ہوگی، چنانچہ ارشاد قرآنی ہے۔ "اَطِیعُوا اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ" (انفال) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو — اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ (مائدہ) اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو — "قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی یُحبِبکُمُ اللّٰہُ" (آل عمران) اے رسول فرما دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت فرمائے گا — لَقَد کَانَ لَکُم فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (احزاب)۔ (اے ایمان والو پیروی کے لئے) تمہارے لئے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے — ان تمام آیات میں رسول کی بعثت کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ رسول کے ہر قول و فعل میں اس کی اتباع کی جائے اس لئے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے رسول کا کوئی قول و فعل اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہوتا یعنی وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا وہ جو کچھ کہتا ہے یا کرتا ہے اذن الٰہی سے کہتا اور کرتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے: "مَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی اِن ھُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوحٰی" میرا رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا اس کی ہر بات وحی خداوندی ہی ہے — ان اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی اِلَیَّ۔ میں وہی کرتا ہوں جس کی مجھے وحی کی جاتی ہے — لہٰذا — رسول ہونے کی حیثیت سے رسول کا ہر قول اور ہر فعل حجّت و دلیل شرعی قرار پائے گا کیونکہ اس کا قول و فعل اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے: "وَمَا اَرسَلنَا مِن رَسُولٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذنِ اللّٰہِ" (نساء) ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے —

— اب یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول کی ذات مرکز اطاعت ہے اُسی کا حکم مانا جائے گا، قانون کا سر چشمہ صرف رسول کی ذات ہے اور اس کا ہر قول اور ہر فعل جو بحیثیت رسالت سرزد ہو حجّت و دلیل شرعی اور واجب الاتباع ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بطور فیصلہ فرما دیا وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ وَمَا نَھٰکُم عَنہُ فَانتَھُوا (حشر) اور جو کچھ رسول تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے رُک جاؤ —

چونکہ رسول کا کوئی قول یا فعل اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا اس کی اطاعت الٰہیہ ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے "مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد اَطَاعَ اللّٰہَ" (انساء) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی — اب یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ رسول کی ہر بات اور ہر عمل خواہ اس کی صراحت قرآن میں موجود ہو یا نہ ہو بہر صورت قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور رسول کے عطا کردہ وہ احکامات جو بظاہر کتاب کے سوا نظر آرہے ہیں وہ بھی درحقیقت من جانب الرسول نہیں ہیں بلکہ منزل من اللہ ہی ہیں —

کتاب و سنت دونوں قانون الٰہی ہیں۔

— آپ ہی کے لئے قرآن تبیانا لکل شئ ہے قرآن کریم کے معانی و مفاہیم کو منشاء الٰہی کے مطابق واضح فرمانا آپ ہی کی ذمہ داری ہے اب اگر آپ قرآن کریم کے کسی عام کو خاص، کسی مطلق کو مقید، کسی مجمل کو مفصّل کسی مبہم کو واضح اور اس کے کسی کلّیہ میں استثناء فرماتے ہیں تو یہ سب کچھ آپ کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ آپ وحی الٰہی ہی سے فرما رہے ہیں اب اگر

وہ وحیِ متلوّ ہے تو ہم اس کو قرآن کہیں گے اور اگر غیر متلوّ ہے تو اُسے حدیث کہا جائے گا ـــــ المختصر ـــ احادیث نبویہ سے جو احکامات ملتے ہیں وہ سب بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں اور بلاشبہ وہ بھی منزّل من اللہ ہیں لہٰذا جو لوگ کتاب کے سوا کسی چیز کو منزّل من اللہ نہیں مانتے وہ سخت غلطی پر ہیں ـــ الحاصل ـــ حقیقی قانون ساز ربّ تعالیٰ ہی ہے اور اسلام اُسی کا عطا کردہ ضابطۂ حیات و دستورِ زندگی ہے ـــ ہاں ـ کتاب و سنّت کو اس ضابطہ و دستور کے احکامات معلوم کرنے میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے ـــ چونکہ ـــ بندوں کا براہِ راست رابطہ رسول کریم ہی کی ذات سے ہے لہٰذا بندوں کے لئے کسی حکم کو حکمِ خداوندی سمجھنا ـــ یا ـــ کسی ارشاد کو ارشادِ خداوندی باور کرنا خود رسول کریم پر ایمان اور آپ کی اطاعت ہی پر موقوف ہے ـــ اسی لئے ـ بندوں کے لئے قوانین الٰہیہ کے علم کے لئے کتاب و سُنّت ہی کو اصل الاصول کا مقام حاصل ہے ـ رہ گئے اجماع و قیاس تو یہ دونوں کتاب و سنّت کے برگ و بار ہیں اور انھیں کے تابع ہیں ـ کتاب و سنّت کے ارشاد فرمودہ ضابطوں اور کلیوں کے تحت جو احکامات ظاہر ہوتے جائیں گے وہ کتاب و سُنّت کے زیرِ سایہ ہی سمجھے جائیں گے اور انھیں قانون الٰہی ہی کہا جائے گا ـ اس سلسلے میں تقریبِ فہم کے لئے درخت کی مثال پیش کی جا چکی ہے ـــــ ذہن نشین رہے کہ ـــ چونکہ ـــ اجماع امّت کتاب و سُنّت کی فرع ہے اس لئے اجماع کی ضرورت انھیں احکام میں ہوتی ہے کتاب و سنّت میں جن کی صراحت نہ ہو ـــ یوں ہی ـــ چونکہ ـــ قیاس شرعی قرآن و سُنّت اور اجماع اُمّت کی فرع ہے اس لئے قیاس کی حاجت وہیں پڑتی ہے جہاں کتاب و سُنّت اور اجماع امّت خاموش ہوں ـــ لہٰذا ـــ کتاب و سنّت میں جن احکام کی صراحت ہو ان میں سے کسی حکم کے خلاف عہد حاضر کے علماء سے اجماع کا مطالبہ کرنے والے ـــ یا ـ جس حکم پر اجماع امّت ہو چکا ہو اس کے خلاف پھر کسی نئے اجماع کی ضرورت کی تجویز پیش کرنے والے ـ یا ـــ جو بات قرآن و سُنّت ـــ یا ـ اجماع امّت سے ثابت ہو چکی ہو اس کے خلاف قیاس فاسد کی آرزو رکھنے والے یا تو شرعی اصولوں سے بالکل ناواقف ہیں ـــ یا ـ جان بوجھ کر شرعی اصولوں کو اکھاڑ پھینک دینے کے خواہشمند ہیں ایسوں کی اہمال سرائیوں پر کان دھرنے

کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

مسلم پرسنل لاٗ کی اصطلاح ـ عہد حاضر کی بہت بڑی گمراہی ہے

اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کو بغور دیکھ لینے اور سمجھ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدائی قانون کی تعبیر "مسلم پرسنل لاء" سے کرنی عہدِ حاضر کی ایک بہت بڑی گمراہی ہے ـــ یا ـــ کم از کم ایک تباہ کن مغالطے میں ڈال دینے والی حرکت ہے ـــ اگر "مسلم پرسنل لاء" سے مراد مسلم دانشوروں کے خود ساختہ ـــ یا ـــ مسلمانوں کے کسی قانون ساز ادارے کے متفقہ منظور شدہ قوانین ہیں تو یہ وہ گمراہی و جہالت ہے جس کی قباحت و شناعت کی شدّت سمجھائی نہیں جا سکتی ـ ظاہر ہے کہ جو قانون بنا سکتا ہے وہ قانون میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتا ہے بلکہ سرے سے پورے قانون کو کالعدم بھی قرار دے سکتا ہے ـــ تو کیا یہ حقوق مسلمانوں کو ـــ یا ـــ ان کے کسی ادارے کو حاصل ہیں کہ وہ اسلامی قوانین میں ردّ و بدل کر دیں اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر اسلامی قوانین کے لئے مسلم پرسنل لاء کی اصطلاح گڑھنا کتنی بڑی جہالت ہے ـ خدائی قانون کو بندوں کا خود ساختہ قانون قرار دینا گمراہی کی بدترین شکل نہیں تو اور کیا ہے ـــ اور اگر ـــ مسلم پرسنل لاء سے خدائی قانون ہی مراد ہے جس کی ترمیم و تنسیخ ـــ یا ـ ردّ و بدل کے سلسلے میں پوری دُنیا کے مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ بھی ناقابل قبول اور واجب الرّد ہے ـــ تو ـــ اس صورت میں یہ اصطلاح شدید مغالطہ آمیز ہوگی ـ جسے اسلامی قانون یا خدائی قانون کہنا چاہئے اس کو مسلمانوں کا اپنا ذاتی قانون قرار دینے سے ہی اسلام کے بدخواہوں کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ آئے دِن اسلامی قوانین میں ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل کے مطالبے کر رہے ہیں اس کام کے لئے کلمہ گو افراد کی ایک ٹیم بھی تیار کر لی گئی ہے اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ جب یہ مسلمانوں کا اپنا ذاتی قانون ہے تو پھر اس کو بگاڑنے اور بنانے دونوں کا حق مسلمانوں کو حاصل ہوگا ـــــ آج اسلامی قانون کو بدل دینے کا مطالبہ کرنے والے کلمہ گو غیر مسلم افراد کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے اسلامی قوانین پر جن کی موشگافیاں اور زہر افشانیاں عالم شباب پر ہیں ـــــ اس اصطلاح کی مغالطہ آمیزی کا حال یہ ہے کہ خود اربابِ اقتدار کی طرف سے بھی یہ بیانات آ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت

کی خواہش کے بغیر حکومت ان کے قوانین میں تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس بیان سے مسلم نما منافقین کو شہ ملتی ہے جس کے نتیجے میں ان کے باطل مطالبات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے ـــــ اور ارباب اقتدار بھی ان مطالبات کی آڑ لے کر اسلامی قوانین کو رفتہ رفتہ بدل دینے کی خفیہ جدّوجہد میں لگے ہوئے ہیں ـــ بلکہ ـــ آگے چل کر انشاء المولیٰ تعالیٰ میں واضح کروں گا کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں جس وقت ایک غیر اسلامی فیصلہ کرلیا گیا تھا تو اس وقت ایوان کی کرسیوں پر بیٹھنے والے مسلمان ممبر نہ کوئی موثر آواز بلند کرسکے تھے اور نہ ہی اپنی بیزاری کے اظہار کے لئے کوئی قدم اٹھا سکے تھے ـــــ ان حالات میں اسلامی قوانین کے تحفّظ کی کمیٹیاں بنانے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ صاف صاف لفظوں میں ہر ہر اسٹیج پر، ہر ہر ماحول میں اور ہر ہر ذریعے سے یہ اعلان کردیا جائے کہ اسلامی قانون مسلمانوں کا اپنا خودساختہ ذاتی قانون نہیں بلکہ خدائی قانون ہے جس میں ترمیم و تنسیخ اور ردّوبدل کا اختیار صرف خالق السمٰوات والارض عالم الغیب والشہادہ ہی کو ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدائی ترمیم و تنسیخ رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ ہی معلوم کی جاسکتی ہے اور اب جبکہ تا قیامت کسی نبی کے آنے کا سوال نہیں تو پھر تا قیامت خدا کی طرف سے ترمیم و تنسیخ کے نزول کا بھی کوئی سوال نہیں ـــ لہٰذا ـــ قیامت تک اب اسلامی قوانین کی شکل و صورت وہی رہے گی جس شکل و صورت میں رسول کریم نے اُسے پیش کیا تھا ـــ اب اگر کسی کلمہ گو کو اسلام کا کوئی قانون پسند نہ ہو تو پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اپنے کو مسلمان سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے اس کو یقین کرلینا چاہئے کہ وہ ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرچکا ـــــــ دیکھا آپ نے ایک جا ہلا نہ اصطلاح کے تباہ کن نتائج و ثمرات ـــ اسلامی قانون خدائی قانون ہے لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ اس کی تعبیر "مسلم پرسنل لا" سے نہ کی جائے بلکہ اسے قانون الٰہی کہا جائے اور کہلایا جائے۔ قانون الٰہی سمجھا جائے اور سمجھایا جائے ـــــــ اسی طرح ہمارے بعض پڑھے لکھے طبقے میں ایک دوسری جہالت بھی پرورش پارہی ہے وہ یہ کہ مسلمان اپنے کو "محمڈن" کہنے لگے ہیں۔ دیکھا دیکھی غیر مسلم بھی ان کو اسی نام سے یاد کرنے لگے ہیں ـــــ تعجّب ہے کہ اسلام دشمن مستشرقین کا دیا ہوا نام اسلامی معاشرے میں پھلے اور پھولے اور خود ربّ کریم کا

عطا کردہ نام ننگ و عار کا باعث بنتا جائے ـــــ اسلام کے ماننے والو! خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ کس قدر پاکیزہ نام کس قدر معنویت سے بھرا ہوا سلامتی کا لباس پہنے ہوئے، طاعت و انقیاد کے محمود جذبات سے معمور از حضرت آدم تا حضرت خاتم رہنے والے اسلام کے ماننے کا واضح نشان الغرض خوبیاں ہی خوبیاں اچھائیاں ہی اچھائیاں ـــــ اس کے برعکس ـــ محمڈن نام سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے دین کے ماننے والے ہیں حضور آیۃ رحمت سے پہلے جس کا وجود نہ تھا اور دوسرا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے کو محمدی کہنے والے جس دین کو مان رہے ہیں اس دین کے بنیادی قوانین کا سرچشمہ ذات رسالت مآب ہی ہے جن کا تعلّق آسمانی ہدایات سے نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں تاثر نہایت گمراہ کن ہیں ـــــ یہ ذہن نشین رہے کہ اسلام کو دین محمدی ـ یا ـــ شریعت اسلامیہ کو شریعت محمدّی کہنے کا میں مخالف نہیں اس کی وضاحت پہلے بھی کرچکا ہوں ـــ بلکہ ـ میں مسلمانوں کے لئے اپنے کو "محمڈن" یا محمدی کہنے کی اصطلاح کو صحیح نہیں سمجھتا اس لئے کہ اس سے بہت ساری غلط فہمیوں کے دروازے کُھل جاتے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں دفعہ ۱۲۵ کا اختراع

۱۹۷۳ء کی بات ہے ہندوستان کی پارلیمنٹ نے ضابطۂ فوجداری کے تحت دفعہ ۱۲۵ کے دھماکہ خیز قانون کا اختراع کیا جسے ۱۹۷۴ء میں باضابطہ اتفاق رائے سے دستوری شکل دے دی اور بلا استثناء ہر دین و مذہب والے پر اس دفعہ کے اطلاق کو لازم رکھا اس دفعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ طلاق یافتہ عوت جو خود کفیل نہ ہو خواہ اس کے شوہر نے خود اس کو طلاق دے دی ہو ـــ یا ـــ اس نے خود اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرلی ہو دونوں صورتوں میں جب تک اس عورت کا عقد ثانی نہیں ہوجاتا اس وقت تک طلاق دینے والے سابق شوہر پر لازم ہے کہ وہ ہندوستانی عدالت کی طرف سے متعیّنہ رقم اس عورت کو گزارے کے لئے بنام نان و نفقہ دیتا رہے ـــــ اسلام میں صرف اس قدر ہے کہ مطلّقہ عورت جب تک عدّت طلاق میں رہے اس وقت تک کے لئے اس کا نان و نفقہ اس کے

سابق شوہر پر لازم ہے ـــ مگر ـ عدّت گزر جانے کے بعد اس عورت کا اپنے شوہر پر اس طرح کا کوئی حق نہیں رہ جاتا ـ بلکہ ـــ اس عورت کی حالت اپنے سابق شوہر کے لئے اِس طرح اجنبیہ کی ہو جاتی ہے جس طرح نکاح سے پہلے تھی ـــ لہٰذا قانون بناتے وقت سیکولرزم کی حامی و داعی پارلیمنٹ کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس دفعہ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دے مگر ایسا نہیں کیا گیا ـ بمبئی کی سرزمین پر آل انڈیا مُسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بھرے اجلاس میں واضح لفظوں میں اس قانون کے اطلاق کی عمومیت کی مذمت کی گئی، اس کے خلاف تجویزیں پاس کی گئیں اور حکومت کے سامنے مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ قرار دینے کا پرزور مطالبہ پیش کیا گیا اور اس کو مسلمانوں کے دین و مذہب میں جارحانہ مداخلت سے تعبیر کر کے تمام مسلمانوں کے دلی رنج و دکھ کا اظہار کیا گیا ـــ مگر ـــ افسوس ہے کہ مداخلت فی الدّین کرنے والے ارباب اقتدار نے طویل خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں دیا اور سیکولرزم کے چہرے پر ایسا بھرپور طمانچہ لگایا کہ آج تک اس کے چہرے کے نشانات مٹ نہ سکے ـــ یہ ہے وہ فسادفی الارض جو دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے دکھ درد کا باعث ہے ـــ قانون تو بہت پہلے بن چکا تھا ـ لیکن، حالیہ سپریم کورٹ کے اسی قانون کے مطابق فیصلے نے پھر زخم کو ہرا کر دیا جس کے نتیجے میں ہر طرف سے زبردست ردِ عمل کا مظاہرہ ہو رہا ہے اور سیکولرزم کے داعیوں کو سیکولرزم کا معنیٰ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے ـــ اس سلسلے میں ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت نے ایک اور پیش قدمی کی ہے میرے خیال میں جو اس کے فرائض میں نہ تھی وہ یہ کہ اُس نے پارلیمنٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ پورے ملک میں بلا استثناء آئین کی دفعہ ۴۴ کے نفاذ کو دستوری شکل دے دے دفعہ ۴۴ میں سب کے لئے یکساں سول کوڈ کی بات کی گئی ہے ـــ عدلیہ کا کہنا ہے کہ اگر پارلیمنٹ نے اس سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا تو عدلیہ خود ہی اس اقدام پر مجبور ہو گی ـــ میں دوسرے مذاہب کے بارے میں تو کچھ عرض نہیں کر سکتا مگر اس حقیقت کو واشگاف انداز میں ظاہر کروں گا کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا اور آئین کی دفعہ ۴۴ کے اطلاق سے مسلمانوں کا اِستثناء نہ کیا گیا تو پھر نہایت

کھلے ہوئے انداز میں مسلمانوں کو ان کے دستوری اور بنیادی حقوق سے محروم کر دینا ہو گا اور ظاہر ہے کہ یہ دستورِ ہند کے ساتھ انصاف نہ ہو گا۔

اسلام اور حقوقِ نسواں کی بحالی

عقل و انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ ان دونوں قانونوں سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے اس لئے کہ مسلمان خود ایک مکمل دین اور جامع دستورِ زندگی رکھتے ہیں، مسلمانوں کا دین ایسا کامل و مکمل ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں واضح رہنمائی فرماتا ہے ـــ تہذیبِ نفس ہو کہ تدبیرِ منزل، سیاستِ مدُن ہو کہ بین الاقوامی مسائل المختصر زندگی کا کوئی "گلی کوچہ" اور حیاتِ انسانی کی کوئی شاہراہ ایسی نہیں جہاں دینِ اسلام کی ہدایات کے چراغ روشنی نہ دے رہے ہوں ـــ اسلامی ہدایات اگر ایک طرف فطرت کے عین مطابق ہیں تو دوسری طرف حدِّ اعتدال سے متجاوز نہیں ـ نہ یہاں عدل و انصاف کا خون ہوتا ہے اور نہ بے شرمی و بے حیائی کی حوصلہ افزائی ـــ دین اسلام رسم و رواج کے کسی مجموعہ کا نام نہیں جو خود انسانی ذہنوں کا اختراع ہوتے ہیں اور وقت و ماحول کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ انسانی خواہشات اور اس کی تمنائیں جو شیش محل تیار کریں گی اس کی عمر اسی قدر تو ہو گی جو خود اس خواہش و تمنّا کی عمر ہے ـــ مستقبل سے بے خبر انسان مستقبل کی صلاح و فلاح کے لئے قانون بنا بھی کیسے سکتا ہے ـــ حاضر پر غائب کو قیاس کر کے جو قانون بنایا جائے گا اس کا سودمند اور فائدہ بخش ہونا کب ضروری ہے ـــ خود ہندوستان کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیجئے اس سرزمین پر نہ جانے کتنی رسموں نے مذہب اور دھرم کے نام پر زندگی حاصل کی اور کچھ عرصے کے بعد خود اپنے پرستاروں کے ہاتھ موت کے گھاٹ پہونچ گئیں ـــ کچھ دن پہلے جسے دھرم کہا جاتا تھا اب اس کو ایک ظالمانہ روش کہا جانے لگا ـ جسے شرم و حیاء کا نام دیا گیا تھا آج اس کی بے حیائی کی بات کی جا رہی ہے ـ جس کی تعبیر عدل و انصاف سے کی گئی تھی آج اسی میں صریح ظلم نظر آرہا ہے ـ جن امور کی انجام دہی میں پرستش کو چار چاند لگنے کا دعویٰ کیا گیا تھا آج انھیں امور میں جہالت کی تاریکیاں نظر آ رہی ہیں ـــ وغیرہ وغیرہ ـــ رہ گیا اسلام تو اس کی بات ہی

کچھ اور ہے یہ عالم الغیب والشہادہ ماضی وحال ومستقبل کے علیم وخبیر کا عطا کردہ ہے لہٰذا قانون سازی میں مستقبل سے بے خبری کا سوال ہی نہیں اٹھتا ـــــ یہ خالق السمٰوات والارض کا نازل فرمودہ ہے ـــ لہٰذا ـــ گردش لیل ونہار اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ـــــــ یہ خالق فطرت کا عطیہ ہے لہٰذا اس کے اصول فطرت شکن نہیں ہو سکتے ـــــ یہ حی وقیوم کا بھیجا ہوا دین ہے اس لئے اس کی ابدیت کے دامن تک کسی طرح کی کوئی آنچ تک نہیں آسکتی ـــــ خدائی قانون کے سامنے انسانی قانون کی حیثیت ہی کیا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسانی قوانین اگر رات میں بنتے ہیں تو دِن میں ٹوٹ جاتے ہیں اور اگر دن کو بنائے جاتے ہیں تو رات کے قابل نہیں رہ جاتے ـــــ المختصر ـــ جب مسلمان دین اسلام جیسا ایک محکم دین رکھتے ہیں تو ان کے مسائل کو انھیں کے دین کی ہدایات کی روشنی میں حل کرنا صرف یہی نہیں کہ عدل وانصاف کا تقاضہ ہے بلکہ جمہوریت نوازی بھی ہے۔ یوں بھی غور کیجئے کہ عورتوں کے جس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس قانون کی وضع کی گئی ہے اسلام اس سے بہتر طریقے پر اُسے حل فرما چکا ہے ـــ اسلام سے پہلے یہ صنف نازک قعر مذلت میں گری ہوئی تھی اور مردوں کے جور واستبداد کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ دنیا کے کسی مذہب میں والدین ـــ یا ـــ شوہر کے ترکہ میں عورت کا کوئی حق نہ تھا اور اب تک بھی اسلام کے سوا کسی مذہب نے عورت کو ترکہ میں کسی کا حقدار نہیں ٹھہرایا ـــ بلکہ ـــ قدیم زمانے میں عورت کی ملکیت اور سارا ساز وسامان لاقانونی کے قانون کے تحت شوہروں کی ملکیت قرار پاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری سے اس ذلیل ومظلوم گروہ کی وہ حق رسی ہوئی کہ دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ حضور علیہ السّلام نے عورت کو عزّت واحترام کے دربار میں مردوں کے برابر جگہ عطا فرمائی اور سارے مفاسد کا انسداد فرمایا۔ عورتوں کے حقوق قائم فرمائے اس کی شخصیت کو اُبھارا اور صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ) یعنی جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ویسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں ـــ نیز ـــ ارشاد ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ

وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا (نساء ع) ـــــ مردوں کے لئے حصّہ ہے جو چھوڑ گئے ان کے ماں باپ اور قرابت دار اور عورتوں کے لئے حصّہ ہے جو چھوڑ گئے اُن کے ماں باپ اور قرابت مند کم ہو یا زیادہ مقرّر حصّہ ـــ اسلام کے قبل عورت کی تذلیل وتحقیر کی ایک وجہ اس کی مالی بے چارگی تھی اس لئے اسلام نے عورت کی مالی حالت کو بھی مستحکم کیا اور اس کے لئے اصول وضع فرمائے۔

۱ـ اُسے وراثت میں حصّہ دار بنایا اور اپنے ماں باپ بھائی، خاوند اور بیٹے وغیرہ کے مال متروکہ اور جائداد منقولہ وغیر منقولہ میں عورت کے حصّے مقرّر فرمائے۔

۲ـ میکے سے ملنے والا سامان جہیز اس کی ملکیت قرار دیا۔

۳ـ اسے اپنی املاک وجائداد پر مالکانہ حق دے کر اس میں تصرّف کا حق دیا۔

۴ـ اپنے حق مہر پر اُسے پُورا پُورا اختیار دیا۔

اور اس طرح بنیادی حیثیت سے عورت کو مرد کے مساوی کر دیا اور ان تدابیر سے عورت کو پستی سے نکال کر بلندی عطا فرمائی اور صحیح معنیٰ میں اُسے مرد کا شریک زندگی اور رفیقۂ حیات بنا دیا ـــــ چونکہ شریعت اسلامیہ میں نکاح مرد وعورت کے مابین ایک شرعی تعلق، دینی رابطہ اور مذہبی اختلاط ہے اس لئے اسلام نے نکاح کے اصول وقواعد مقرّر کئے۔ میاں بیوی کے حقوق متعیّن کئے تاکہ کوئی فریق کسی فریق کے حقوق پامال نہ کر سکے ـــــ ساتھ ہی ساتھ حُسن معاشرت کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (نساء ع ۳) عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے بود وباش رکھو ـــ سرکار رسالت ارشاد فرماتے ہیں ـــ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (ترمذی، دارمی، ابن ماجہ) تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے سب سے اچھا ہو اور میں اپنے اہل کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ۔ پس عورتوں کے معاملے میں تم خدا سے ڈرو کیونکہ تم نے ان کو عہد خدا کے ساتھ لیا ہے ـــ الغرض قرآن کریم نے اس باب میں سخت تاکید کی ہے کہ وہ عہد وپیمان جو زن وشوہر کے درمیان شرعی طور پر وجود میں آئے ہیں حتیّ الامکان قائم

رکھے اور مقدور بھر انہیں ٹوٹنے نہ دیا جائے ـــ لیکن ـــ دو طرفہ تعلقات میں جب ہمدردی وغمخواری باقی نہ رہے۔ محبت و اخلاص ناپید ہو جائے، وہ ایک دوسرے کے لئے راحت وتسکین کا سرمایہ نہ بن سکیں، حقوق زوجیت تلف ہونے لگیں غرض کہ نبھاؤ مشکل ہو جائے اور دفع شر کے لئے علیحدگی کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں شریعت اسلامیہ نے علیحدگی وجُدائی کے لئے بھی ایک نظام ایک قانون دیا ہے جسے عرف شریعت میں طلاق کہا جاتا ہے ـــ نکاح سے عورت شوہر کی پابند ہو جاتی ہے اس پابندی کو اٹھا دینے کو طلاق کہتے ہیں ـــ شریعت میں طلاق مباح ہے مگر "اَبْغَضُ الْمُبَاحَات" یعنی تمام حلال چیزوں میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ۔ اسی لئے شریعتِ اسلامیہ نے اس نظام پر بھی چند پابندیاں عائد کر دی ہیں جن کی وجہ سے طلاق کی اجازت کا استعمال محض وقتی اور ہنگامی اثرات کا نتیجہ نہ ہو۔ ـــ طلاق کا وجود خاص خاص دشواریوں کے حل کے لئے ضروری ہے اور اس وقت طلاق کی ضرورت ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسے کسی حصہ جسم میں زہریلا مادہ پیدا ہو جانے کے باعث اس کا جسم انسانی سے بذریعہ قطع وبرید جدا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اگرچہ عضو کا کاٹنا بہر حال ناپسندیدہ سمجھا جائے ـــ

ـــ طلاق دینے والے کو شریعت اسلامیہ پہلے سمجھاتی ہے کہ اب وہ ایک ایسے فعل کا اقدام کرنے جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسندیدہ بھی ہے اور مبغوض بھی لہٰذا جب تک یہ مسلّم نہ ہو جائے کہ صرف یہی صورت مرد کی بقاء وصحت اور حفاظت عزت وایمان کی رہ گئی ہے اس وقت تک اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے چند تفصیلی احکام دیئے۔ مثلاً

۱۔ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (نساء) اور اگر وہ عورتیں تمہیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھدی ہو ـــ اور ہو سکتا ہے کہ وہ بھلائیاں ازدواجی زندگی اور گرہستی میں بڑی اہمیت رکھتی ہوں ـــ لہٰذا ـــ یہ بات پسندیدہ نہیں کہ آدمی ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے ـــ طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے جس کو بدرجہ مجبوری کام میں لانا چاہئے۔

۲۔ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا ۔ الآیۃ (نساء) اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ کرے ـ تو ـــ ان پر گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح خوب ہے ـــ یعنی ایک عورت اگر اپنے شوہر کو اپنے سے بے رُخ پائے، پھرا ہوا دیکھے یا بے پرواہ بلکہ ظلم وزیادتی کرنے والا پائے تو اس صورت میں بھی طلاق وجُدائی اختیار کرنے سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ وہ صبر وتحمل سے کام لے اور ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرے اور اس طرح باہمی مصالحت اور میل ملاپ کی فضا ہموار کرے اور پھر اس میل ملاپ کے بعد اسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصّہ گزار چکی ہے ـــ ازدواجی تعلقات میں تلخی دور کرنے کا یہ ایک ایسا نسخہ ہے جسے شریعت اسلامیہ نے عورت کے اختیار وتصرف میں دیا ہے۔

۳۔ بیویاں اگر ناشائستہ، ناشزہ، نافرمان اور حقوق شوہر سے لاپرواہ ہوں جس کے باعث پُرمسرت ازدواجی زندگی کے بجائے آپس میں تصادم اور دھینگا مشتی شروع ہو جائے تو ایسی صورت میں اصلاح احوال کے لئے قرآن کریم نے مردوں کو تین تدبیریں بتائیں ہیں۔

اوّل :- فَعِظُوْهُنَّ انھیں سمجھاؤ اور بتاؤ کہ شوہر کی نافرمانی اور اس کی اطاعت نہ کرنے اور اس کے حقوق کا لحاظ نہ رکھنے کے نتیجے میں دنیا وآخرت دونوں میں خسران ووبال کے سوا کچھ نہیں اور خدا کا عذاب مول لینا کوئی دانشمندی کی بات نہیں۔ اگر عورت شریف طینت ہے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہو گا۔ اس میں بھی شوہر کو یہ تعلیم ہے کہ فوراً غصہ میں آکر کوئی کارروائی نہ کرے۔

دوم :- اب بھی اگر اصلاح نہ ہو تو سزا کی دوسری منزل یہ ہے وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ مرد کچھ عرصہ کے لئے عورت سے بات چیت ترک کریں انھیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دیں۔

سوم :- یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو اور عورت اپنی سرکشی ونافرمانی پر قائم رہے جیسا کہ بعض رذیل طبقوں میں دیکھا جاتا ہے تو اب تیسرا علاج یہ ہے کہ وَاضْرِبُوْهُنَّ تادیب کے طور پر ہلکی مار ماری جائے ایسی ضرب نہ مارے جس سے جلد پریشان ہو جائے ـــ عورت کیسی ہی بے غیرت

کیوں نہ ہو معمولی مار سے راہِ راست پر آجاتی ہے تاہم بعض بدخصلت عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ کسی تدبیر سے درست ہی نہیں ہوتیں اور اپنی سرکشی و نافرمانی میں حد سے تجاوز کر جاتی ہیں ۔ تو ۔ اب شریک زندگی سے نبھاؤ کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اس روز روز کی چیخ و پکار کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر گھر رسوائی ہوتی ہے اور مرد و عورت دونوں کے لئے یہ دنیا جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے ۔ ایسی حالت میں شریعت اسلامیہ پھر دونوں کو ایک اور موقع دیتی ہے وہ یہ کہ فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا یعنی جہاں میاں بیوی میں ناموافقت اور ایسی کشمکش پیدا ہو جائے جسے وہ باہم نہ سلجھا سکیں تو دو ثالث مقرر کئے جائیں تاکہ نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر ہی میں کوئی اصلاح کی صورت نکل آئے ۔ اس مصالحت و مفاہمت کی تدبیر یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض سے مقرّر کیا جائے کہ دونوں مل کر اختلاف کے اسباب کی چھان بین کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں ۔ اسلام کو یہ بات پسند نہیں کہ خانگی الجھنوں اور میاں بیوی کے مابین مناقشوں کا علم ہونے کے باوجود ان کے خاندان کے بااثر، بارسوخ اور باوقار افراد دامن سمیٹ کر الگ تھلگ ہو جائیں جیسے کہ ان کا اُس سے کوئی تعلق ہی نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ اس خانگی نزاع کو لوگ اپنا ہی معاملہ سمجھیں اور اپنی سی کوشش میں کوئی کمی نہ کریں ۔ بلکہ ۔ زوجین اگر اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی کسی کو منتخب نہ کریں تو انھیں چاہئے کہ اپنے اپنے خاندان کے وقار کی خاطر مداخلت کریں اور احکام شرعیہ کی روشنی میں مناسب فیصلہ دیں ۔ ماننا نہ ماننا ان دونوں کے اختیار میں ہے ۔ اب بھی اگر اصلاح نہ ہو اور اصلاح احوال کی تمام تدبیریں رائیگاں جائیں اور قصور کا بوجھ صرف عورت پر ہو تو اب شوہر کو اجازت ہے کہ اسے طلاق دے دے ۔ اور وہ بھی اس طریقے سے کہ جب عورت اپنے ایام معمولہ سے فارغ ہو تو حالت طہر میں ایک مرتبہ طلاق دیجائے اور اگر جھگڑے کے وقت طہر کی حالت نہ ہو تو شوہر کو انتظار کرنا چاہئے کہ وہ حالت طہر میں آجائے ان ایام کا یہ انتظار بھی طلاق کے روک

کے لئے ہیں ۔ اب پہلی طلاق کے بعد بھی عورت کے دل میں ندامت نہ ہو ۔ یا ۔ شوہر کے دل میں قوّت برداشت نہ ہو اور ایک ماہ گزرنے پر عورت دوسری بار حیض سے فارغ ہو جائے تو اب شوہر دوسرے مہینے میں طلاق دے سکتا ہے ۔ اب پھر ایک مہینے کی لمبی میعاد ان دونوں کے درمیان ہے ۔ اس میعاد میں اگر جھوٹے غصے بے جا بدگمانیاں اور فضول شکایتیں معدوم ہو چکیں اور دونوں میں پھر نبھاؤ کی خواہشیں بیدار ہو رہی ہیں تو شریعت مرد کو رجعت کا حکم دیتی ہے اور اس رجعت کے آڑے آنے والی جھوٹی ناموریوں، خاندانی وجاہتوں، دنیاوی طعنوں اور دشنام طرازیوں کو کچل کر دونوں کو پھر میاں بیوی کی طرح رہنے کی اجازت دیتی ہے بلکہ پہلی ۔ یا ۔ دوسری طلاق کی عدّت بھی گزر جائے تب بھی دونوں کے لئے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے نکاح کر لیں گویا اس آخری گنجائش سے فائدہ اٹھا کر تعلقات زوجیت از سر نو قائم کر لئے جائیں البتہ شریعت مطہرہ نے مردوں کو تنبیہہ فرمائی ہے کہ رجوع کرتے ہو تو اس نیت سے کہ اب حسن سُلوک سے رہنا ہے ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقہ پر رخصت کر دو ۔ زوجیت میں واپسی خانہ آبادی کے لئے ہونی چاہئے نہ کہ خانہ بربادی کے لئے اب اگر ان دو طلاقوں کے بعد بھی ناخوشگوار تعلّقات کا خاتمہ نہ ہوا اور نفرت و ضد کی بنیاد ایسی مضبوط ہے کہ مرد اب تک طلاق ہی پر تُلا ہوا ہے اِدھر عورت دوسری طلاق کے بعد ایّام ماہواری سے فارغ ہو چکی ہے تو اب شریعت اُسے بتلاتی ہے کہ دیکھ یہ ہُما تیرے ہاتھ سے نکلنے والی ہے ۔ چڑیا اڑ گئی تو کف افسوس ہی ملنا پڑے گا خوب سمجھ لے ۔ لیکن مرد اپنی بات پر اڑا ہوا ہے تو شریعت اُسے مجبور نہیں کرتی اور معاہدہ شادی کو زندگی بھر کے لئے طوق لعنت بنانا گوارا نہیں کرتی ۔ البتّہ ۔ اس تیسری طلاق کے بعد نہ تو شوہروں کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے ۔ اب حلالہ کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ۔ مجھے امید ہے کہ قوم کی سمجھ دار بیٹیاں اور بہنیں مذکورہ بالا تحریر سے ضرور فائدہ اٹھائیں گی اور کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لیں گی کہ شریعت اسلامیہ نے کس طرح عورتوں کے حقوق کی حفاظت فرمائی ہے اور ان کی زندگی

کو بامقصد و باوقعت بنایا ہے۔ کیا نئی تہذیب کے کسی بھی گوشے میں یہ موتی دستیاب ہو سکتے ہیں جن سے اسلام نے عورت کے دامن کو مالا مال فرمادیا ہے۔

نان و نفقہ کے فطری قوانین

شریعت اسلامی میں اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا سنگ بنیاد میاں بیوی کے صحیح تعلقات ہیں ان صحیح تعلقات کو بحسن و خوبی برقرار رکھنے کے تعلق سے جو نصوص ہیں اگر ان سب کو ذکر کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے ـــ لیکن ـــ جب نوبت یہاں تک آجائے کہ دونوں حقوق زوجیت ادا نہ کر سکیں اور موافقت کی تمام راہیں بند ہو جائیں اور عورت کو اس مرد سے اس حد تک نفرت ہو جائے کہ اس کے ساتھ نباہ نہ کر سکے ـ یا ـ مرد کے عنّین ـ یا ـ خصی ـ یا ـ مخنّث ـ یا ـ جنس دوام کے مجرم ہونے کے سبب عورت اس سے خلاصی چاہتی ہو تو قید نکاح سے مخلصی پانے اور شوہر سے طلاق حاصل کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عورت اپنے کل مہر سے ـ یا ـ اس کے کسی حصہ سے دستبردار ہو جائے ـ یا ـ اپنے پاس سے کچھ مال دے کر شوہر کو طلاق پر آمادہ کرلے تو یہ بھی علیحدگی کی جائز صورت ہوگی اور اس مال کو قبول کر لینا شوہر کے لئے درست ہوگا۔ طلاق کی اس خاص صورت کا نام جس میں طلاق کی خواستگار عورت ہو شریعت کی اصطلاح میں خُلع ہے ـــ اِسلامی شریعت نے حقوق نِسواں کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ میاں بیوی میں بذریعہ طلاق جدائی کے بعد بھی شریعت کا حکم ہے کہ عدّت بھر بیوی کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا جائے۔ مطلّقہ بیویوں کی سکونت کے لئے مکان ہی نہیں بلکہ عدّت بھر ان کے کھانے پینے وغیرہ کے ضروری مصارف بھی شوہر کے ذمّہ ہیں۔ یہ نہ ہو کہ طلاق کے بعد عورت کو تہی دست کر کے بھوکا پیاسا اسی وقت گھر سے نکال دیا جائے ـــ عدّت کی مدّت گزر جانے کے بعد اب اسلامی قانون میں مطلّقہ کی کوئی ذمّہ داری سابق شوہر پر نہیں رہ جاتی اس کے سوا کہ اگر اس نے اب تک مہر ادا نہ کی ہو تو ادا کر دے ـــ ایسی صورت میں لازمی طور پر اس کے نان و نفقہ کا سوال کھڑا ہوتا ہے ـ قربان جائیے شریعت اسلامیہ پر کہ اس نے اس نازک وقت پر بھی اس کمزور مخلوق کی دستگیری فرمائی ہے اور اُسے بے سہارا

نہیں رہنے دیا ہے اور نفقہ کے تعلق سے ایک پورا ضابطہ عطا فرمادیا ہے جس نے اس مطلّقہ عورت کو بھی غیر اسلامی قانون کا سہارا لینے سے بے نیاز کر دیا ہے ـــ شریعت اسلامیہ میں نفقہ واجب ہونے کے تین سبب ہیں نمبر۱ زوجیت (میاں بیوی کا رشتہ) نمبر۲ نسب نمبر۳ ملک ـــ طلاق سے رشتہ زوجیت تو منقطع ہو جاتا ہے لیکن جس جس سے اس کے نسبی تعلّقات ہیں وہ برقرار رہتے ہیں ـــ یہ صحیح ہے کہ شادی کے بعد عورت کا نفقہ صرف شوہر کے ذمّہ ہے لیکن زوال نکاح کے بعد اگر عورت نادار ہے تو پھر اس کا نفقہ انھیں قریبی نسبی تعلق رکھنے والوں پر واجب ہو جاتا ہے جن پر انعقاد نکاح سے پہلے واجب تھا ـــ اور بالفرض اگر کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو اور دور والا موجود ہو تو نفقہ اس دور کے رشتہ دار پر واجب ہے۔ اسی لئے صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ ـــ اَلنَّفَقَۃُ مُتَعَلِّقَۃٌ بِالْاِرْثِ بِالنَّصِ۔ (ہدایہ ثانی) نص سے اشارہ ہے ارشاد ربانی وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذَالِکَ (بقرہ) کی طرف ـــ اور اگر وہ بیٹے والی ہے تو بیٹے پر اس کا نفقہ واجب ہے یہاں تک کہ اگر بیٹا ماں باپ دونوں کو نفقہ نہ دے سکتا ہو مگر ایک کو دے سکتا ہو تو ماں زیادہ مستحق ہے ـــ فقہاء کرام کے نزدیک یہ مسلّمہ ضابطہ ہے کہ "مَنْ کَانَ مَحْبُوْسًا بِحَقٍ مَقْصُوْدٍ لِغَیْرِہٖ کَانَتْ نَفَقَتُہٗ عَلَیْہِ" اسی لئے اگر بیوی ہی زوجیت میں رہتے ہوئے خود سپردگی کے لئے آمادہ نہ ہو اور شوہر کی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دے تو وہ مستحق نفقہ نہیں رہ جاتی ـــ نفقہ کے تعلّق سے پوری تفصیلات فقہی کتابوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں یہاں پر حسب ضرورت اشاروں پر اکتفا کر رہا ہوں ـــ المختصر۔ زوجیت کے زوال کے بعد زوجیت سابقہ کو بنیاد بنا کر عورت کے قریبی ـ یا ـ دور کے رشتہ داروں کی موجودگی میں سابق شوہر پر عورت کے گزارے کے لئے جبراً کوئی رقم مقرر کرنا ایک غیر فطری اور ظالمانہ رویّہ ہے اسلام جس کی تائید نہیں کرتا ـــ جن دھرموں نے طلاق کے بعد عورت کو بے سہارا چھوڑ دیا ہو اور اس کے نسبی رشتہ داروں پر اس کی کوئی ذمّہ داری نہ رکھی ہو ان ناقص و نامکمّل مذاہب کے ماننے والوں کے لئے کوئی کیسا بھی قانون بنائے ـــ مگر ـــ اسلام کے ماننے والے ایک کامل و مکمّل دین والے ہیں ان کو دستوری

حیثیت سے تہی دست اور نادار نہیں سمجھنا چاہئے ــــ بلکہ ــ میری مخلصانہ تجویز تو یہ ہے کہ دوسرے مذاہب رکھنے والوں کو بھی مشکلات حل کرنے کے لئے اسلام ہی کی بارگاہ میں حاضری دینی چاہئے اور اسی کے فطری قوانین کو اپنا کر اپنی ہر مشکل کا حل تلاش کرنا چاہئے ــــ یہ نہ دیکھئے کہ یہ قانون کس کا ہے بس صرف اتنا یقین کر لیجئے کہ آج کے دور کی جملہ مشکلات کا حل اور ہر دور کا مداوا اگر ہے تو صرف یہی قانونِ الٰہی ہے ــــ صدیاں گزر گئیں مگر اسلامی دستور کی پیشانی پر شکن بھی نہ پڑی اس کی شادابی آج بھی بدستور باقی ہے بلکہ شروع سے آج تک وہ ڈوبتوں کو کنارا اور گرتوں کو سہارا دیتا رہا ہے ــــــ یہ اسلام ہی ہے جس نے اگر ایک طرف زکوٰۃ و فطرہ و دیگر صدقات واجبہ اور حقوق کے حقوق کی ادائیگی کو فرض وواجب قرار دیا ہے تو دوسری طرف انفاق فی سبیل اللہ صلہ رحمی (رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک) ایثار و قربانی اور اقرباء نوازی و غرباء پروری کی واضح لفظوں میں ترغیب وتحریص دلائی ہے ــــ اور ان امور سے دنیا و آخرت کی سعادت و نجات کو وابستہ فرما دیا ہے ــــ نبی کریم کا ارشاد ہے کہ "بیوگان و مساکین پر خرچ کرنے والا راہ خدا (جہاد و حج) میں خرچ کرنے والے کی طرح ہے" (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین) ــــ اپنے اس ارشاد میں بیوگان کا خصوصی طور پر ذکر فرما کر بیواؤں کے مسئلے کی اہمیت کو کیسا واضح فرما دیا ہے۔ بیوہ کے ساتھ دنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص توجہ برتی ہی نہیں بلکہ بعض مذہبوں نے تو بیوہ کو زندہ ہی جلا دیا ہے۔ اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے اور پورے باوقار انداز سے سہاگنوں کی طرح زندہ رہنے کا حق عطا فرمایا ہے اور اُسے اختیار دیا ہے کہ جس جائز و شرعی طور پر چاہے اپنی زندگی گزارے ــــ عہد حاضر کے قانون سازوں سے پوچھئے کہ زوال نکاح کے بعد طلاق یافتہ عورت کے گزارے کے لئے اس کے سابق شوہر کو (جس کی حیثیت اب ایک اجنبی سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے اور جو عقلاً، شرعاً، قانوناً ہر طرح انعقاد نکاح سے پہلی والی حالت میں پہونچ گیا ہے) دستوری ظلم وجبر کا نشانہ بنانے والو ــــ کبھی ــــ بیواؤں کی آہ و پکار بھی تمہارے کانوں تک پہونچی؟ تم نے ان کے گزارے کے لئے کونسا قانون بنایا ہے؟ ــــ عقل و دانائی

اور عدل و انصاف کی روشنی میں جواب دو کہ کیا بیواؤں کے گزارے کے لئے اور ان کی باوقار و باوقعت زندگی کے لئے جو شریفانہ حل تجویز کیا جاسکتا ہے وہی حل مطلقہ کی باوقار زندگی کے لئے نہیں تجویز کیا جاسکتا؟ پھر کیا ضرورت ہے ایک ایسے قانون کے اختراع کی جو ایک طرف اگر عقل و دیانت کے خلاف ہے تو دوسری طرف ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والا ہے، کسی کے دین میں مداخلت کر کے جمہوریت کے چہرے پر سیاہی لگانے میں کون سی نیک نامی ہے؟

مسلمان! اسلامی سزاؤں کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا بھی عجیب حال ہے اس لئے کہ وہ ہر جگہ اپنے دین و مذہب کی ہدایات کے مطابق اپنا فیصلہ چاہتے ہیں لیکن حدود کے معاملے میں ان کا رویہ الگ ہے کبھی انھوں نے یہ آواز نہیں اٹھائی کہ اگر کوئی مسلمان چوری کرے تو حکومت وقت کو چاہئے کہ اس کا ہاتھ کاٹ لے ــ یا ــ بدکار کو کوڑے یا رجم (سنگساری) کی سزا دے ــ بلکہ ــ اس سلسلے میں وہ تعزیرات ہند کے فیصلے ہی پر راضی نظر آتے ہیں آخر ایسا کیوں؟ ــــ یہ سوال اگر تعصب و عناد کی پیداوار نہیں تو اس میں جہالت و نادانی کا دخل ضرور ہے ــــ حد و تعزیر کی تعریف اور ان دونوں کے تعلق سے اسلامی ہدایات کو معلوم کرنے کے بعد خود بخود سچائی کھل کر سامنے آجاتی ہے ــ حد ایک قسم کی سزا ہے جس کی مقدار شریعت کی طرف سے مقرر ہے اس میں کمی و بیشی نہیں ہو سکتی اس سے مقصود لوگوں کو ایسے کام سے روکنا ہے جس کی یہ سزا ہے ــــ حد قائم کرنا بادشاہ اسلام ــ یا ــ اس کے نائب کا کام ہے یعنی باپ اپنے بیٹے پر، استاد اپنے شاگرد پر، شوہر اپنی بیوی پر اور بڑا اپنے چھوٹے پر حد قائم نہیں کرسکتا ــــ المختصر ــــ اسلام حد کے نفاذ کا اختیار صرف حکومت اسلامیہ ہی کو دیتا ہے ــ لہٰذا ــ کسی غیر اسلامی حکومت سے اسلامی حدود کے نفاذ کا مطالبہ مسلمان کیسے کرسکتا ہے؟ ــ رہ گئی تعزیر ــ تو ــ تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو کسی گناہ پر بغرض تادیب دی جائے شریعت اسلامیہ میں اس کی کوئی مقدار معین نہیں بلکہ اس کو حاکم (قاضی) کی رائے پر چھوڑا ہے کہ جیسا موقع ہو اس کے مطابق عمل کرے ــــ

تعزیر کا اختیار صرف بادشاہ اسلام ہی کو نہیں بلکہ شوہر بیوی کو، ماں باپ اپنی اولاد کو اور استاد شاگرد کو تعزیر کر سکتا ہے۔ تعزیر کی بعض صورتوں میں محض زجر و توبیخ اور تفہیم و تنبیہہ بھی کافی ہو سکتی ہے جہاں یہ کافی ہو وہاں کوڑے مارنا ہی ضروری نہیں یوں ہی حاکم اسلام کی طرف ہر معاملہ میں رجوع نہ کیا جائے گا مثلاً چھوٹے بچے کو بھی تعزیر کر سکتے ہیں ــــــ تعزیر کے نفاذ کے لئے چونکہ حکومت اسلامیہ کی شرط نہیں اس لئے غیر اسلامی حکومتوں کو بھی تعزیر کا اختیار ہے ــــــ دستور ہند میں "تعزیرات ہند" ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ یہ اسلامی حدود ہیں اور نہ انھیں اسلامی حدود کہہ کر پیش کیا گیا ہے اور نہ یہ حکومت اسلامی حدود کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے پھر اس سے اسلامی حدود کے نفاذ کا مطالبہ چہ معنیٰ دارد ؟ــــ بالفرض ــــ اگر حکومت وقت انھیں اسلامی حدود کو اپنا کر تعزیرات ہند میں داخل کر لے جب بھی ان کی حیثیت تعزیرات ہی کی ہو گی نہ کہ اسلامی حدود کی۔ اس لئے کہ شریعت اسلامیہ نے حد کو اپنی ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال فرمایا ہے ــــــ "سلطان اسلام ــ یا ــ اس کے نائب کا بعض جرائم متعینہ کے مرتکبین کو کتاب و سنّت کی روشنی میں شریعت اسلامیہ کی مقررہ و متعینہ سزا دینی" ــــــ اسے اسلامی نقطۂ نظر سے حد کہتے ہیں غیر اسلامی حکومت میں جس کا وجود مفقود بلکہ غیر متصور ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تاریخی خطبات کی جھلکیاں

مولانا ابوالکلام آزاد اس ملک کی معروف و مشہور علمی و سیاسی شخصیت تھے حکومت ہند میں آپ کو جو خصوصی مقام حاصل تھا اور انھوں نے ملک کی سالہا سال تک جو رہنمائی کی تھی اس سے ملک کا ہر ذی شعور شخص بخوبی واقف ہے۔ خود گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے چوٹی کے لیڈروں نے بارہا ان کی علمی و سیاسی برتری کا اعتراف کیا ہے ــ بلکہ ــ دونوں زندگی بھر مولانا آزاد سے اہم مشورے حاصل کرتے رہے اور ان کی رائے کا کامل احترام کرتے رہے ــــــ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر مولانا آزاد کے بعض اُن زریں خیالات سے بھی قوم کو آشنا کر دیا جائے جس کا تعلق ہمارے سامنے پیش آمدہ مسئلے سے بھی ہے ــ چونکہ مولانا آزاد اس ملک کی ایک متفقہ عظیم

سیاسی شخصیت تھے اس لئے ہمارے دوسرے برادران وطن کو بھی ان کے خیالات سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے ــــــ اس اقتباس میں جو کچھ ہے وہ سب ہفتہ وار ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ کی ۲۱ اپریل ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں مطبوعہ مضمون بعنوان "اسلامی احکام و فقہ کی ترمیم مولانا آزاد کی نظر میں" سے ماخوذ ہے۔ ــــــ مولانا آزاد "قومیت اور اسلام" کے زیر عنوان منافی اسلام اور غیر منافی اسلام قومیت کی تشریح کے بعد ترکی اور ایران کی قومیت کو ناقابل تقلید قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ترکی اور ایران میں قومیت اور وطنیت کے نام پر جو کچھ کیا گیا اس سے ہمیں بھی متوحش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ان ممالک کی نظیر کو سامنے رکھ کر اُن کی سو فیصد تقلید ہرگز نہ کرنی چاہئے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے جو کچھ اصلاحات مذہب کو نظر انداز کر کے کیں وہ مذہبی اصلاح کے راستے سے بھی لائی جا سکتی تھیں مصطفیٰ کمال اپنی قوم کو جس منزل پر لانا چاہتا تھا اس منزل پر لانے کے لئے مغربی نظریہ قومیت کی تقلید کرنا ضروری نہ تھا"

(نیشنل تحریک مجموعہ خطبات آزاد)

یورپ میں وطن پرستی کے نام پر جو کچھ کیا گیا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وطن پرستی کے اس نظریہ کی بنا پر جو یورپ میں پایا جاتا ہے ان ممالک میں جو کچھ کیا گیا وہ ہمارے لئے کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں ہمارے لئے یہاں رہ کر ہندستانیت اور اسلام دونوں رشتوں کو باقی رکھنا ہے اور یورپ کی قوموں کی طرح ہم ایک لمحے کے لئے بھی اسلام کے اس وسیع رشتے کو جو ہم کو دنیا کے کروڑوں انسانوں سے وابستہ کرتا ہے ہندوستانی قومیت کے اندر فنا نہیں کر سکتے اس میں شک نہیں کہ اس وقت زمانے کی آب و ہوا اسی قسم کی ہے کہ ہر پڑھے لکھے نوجوانوں کے دماغ میں قومیت کا یہی تصوّر آتا ہے لیکن ہمیں ہر ہر منٹ اور ہر ہر سکنڈ اس کی تردید کرنی چاہئے اور مسلمانوں کے دماغ میں اس غلط نظریئے کو ہرگز جڑ نہ پکڑنے دینا چاہئے" (ایضاً)

کلچر، تہذیب اور تعلیم کے مسئلے میں ہندو مسلم کے عدم امتیاز کو مسلمانوں کے لئے نا قابل قبول قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر سمپورنانند جی نے یوپی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ تعلیم کے مسئلے میں ہندو مسلم کا امتیاز دیکھنا نہیں چاہتے اور نہ کلچر و تہذیب کے معاملے میں ہندو مسلم امتیاز پسند کرتے ہیں تو یقیناً انھوں نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا نہ تو کانگریس ہی کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان ہی اس مقصد سے قیامت تک متفق ہو سکتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلم تعلیم، مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم خصائص کے امتیازی اوصاف فنا ہو جائیں اور وہ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہو کر جرمن یا انگریز کی طرح ہندوستانی قوم کے سوا اور کچھ نہ رہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ فرقہ وارانہ اختلافات کو مٹا دینا چاہئے تو اس کا مطلب اور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت فرقہ وارانہ عناد کی جو فضا پائی جاتی ہے وہ باقی نہ رہے اور تمام فرقے ہم آہنگی کے ساتھ باہمی تعاون و اشتراک کے ساتھ زندگی گزاریں۔" (ایضاً)

اقلیتوں کے تحفظ کی جو دفعہ ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے پاس کی تھی اور ۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اس میں جو ترمیم کی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"کانگریس نے اقلیتوں کے تحفظ کی جو دفعہ ۱۹۳۱ء کے اجلاس میں پاس کی ہے اس میں مسلمانوں کی امتیازی ملی حیثیت کو باقی رکھنے کا یقین دلایا گیا ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس تجویز کو عملی شکل دینے کا ڈھنگ کیا ہو؟ سو اب تک اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی کیونکہ ابھی تک ہم میدانِ جنگ (آزادی) میں تھے۔ مگر کانگریس کے عہدے قبول کر لینے کے بعد ایک نئی صورت حال سامنے آگئی ہے سو اب اس کو سوچا جائے۔ کراچی کی اس تجویز کی توثیق مزید کے لئے گزشتہ سال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ میں جو تجویز پاس ہوئی تھی وہ میں نے لکھی تھی بعد میں جواہر لال نے اس میں کچھ ترمیم کی اس میں ایک قدم اور آگے

بڑھ کر یہ کہا گیا ہے کہ ہم نہ صرف اقلیتوں کے رسم خط، زبان اور کلچر وغیرہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کو ترقی بھی دیں گے اس تجویز کا مقصد صاف طور پر یہ ہے کہ مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو ہندوستان کی قومیت میں جذب کر دینا کانگرس کا مدعا ہرگز نہیں۔" (ایضاً)

اقلیتوں کے رسم الخط کے تحفظ وغیرہ کو مثال سے واضح کرنے کے بعد مسلمانوں کے لئے لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے اور قومیت کے نظریئے کو کس حد تک تسلیم کرنا چاہئے اس سلسے میں فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کو صاف طور پر چلا کر اور پکار کر اعلان کر دینا چاہئے اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان میں جذب ہونے کے لئے ایک لمحہ کے واسطے بھی تیار نہیں بحیثیت مسلمانوں کے ان کی جو ملی خصوصیات ہیں ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے بلکہ ان کو ترقی دیں گے۔ کانگرس میں شریک ہونے اور آزادی کی جدوجہد میں اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش چلنے کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ مسلمان اپنے امتیازی ملّی خصائص کو خیرباد کہہ دے اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کے سمندر میں اپنے جداگانہ ملی عنصر کو محو کر کے رکھ دے۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے اور نہ انشاءاللہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان میں رہنے سہنے کی وجہ سے ہمارے اور ہندوؤں میں جو چیزیں مشترکہ ہو گئی ہیں ہمیں ان کا مقاطعہ بھی نہ کرنا چاہئے۔ جیسا کہ ہندو مہاسبھا نے مقاطعہ کی آواز بلند کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے میلے میں نہ جائیں وغیرہ وغیرہ البتہ وہ خصائص جو ہم کو ہندوؤں سے ممتاز کرتے ہیں ان کو بھی نہ چھوڑنا چاہئے بلکہ ہندوستان کی ملی جلی مشترکہ زندگی میں ایک ممتاز مگر ہم آہنگ جز کی طرح رہنے کی کوشش کرنا چاہئے گویا قومیت کے نظریئے کو اسی حد تک تسلیم کرنا چاہئے جہاں تک ہمارے ملّی خصائص کو محفوظ رکھ کر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔" (ایضاً)

ایک بار مولانا آزاد نے کلکتہ کے قلعہ کے میدان میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد پرستاران حق کو مخاطب کر کے واضح الفاظ میں اعلان فرمایا تھا۔

"جو لوگ رفتار زمانہ سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذاہب کی اصلاح و ترمیم کی طرف مائل ہیں اصلاح کا یہ سلسلہ گزشتہ تین سو سال سے قائم ہے۔ عیسائیوں نے اس اصلاح کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ عیسوی مذہب کے احکام اقتضائے زمانہ و تغیر ماحول کا ساتھ نہ دے سکے یہی حال ہمارے ہندو بھائیوں کا ہے کہ وہ جب تک منوجی کی شاستر میں ترمیم و اصلاح نہ کریں وہ مقتضیات زمانہ سے مقابلے کے اہل نہیں ہو سکتے اور ان کو ہر قدم پر منوجی کے شاستر میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ شاید حقوق نسواں کے متعلق دیگر مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کے احکام کو توڑ مروڑ کر اس قابل بنا رہے ہیں کہ وہ مقتضیات زمانہ کے مطابق ہوں۔ لیکن میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو مذہبی احکام میں اس طرح ترمیم و اصلاح کی یکسر ضرورت نہیں کیونکہ ان کی شریعت کے قوانین جامع و مکمل ہیں ان میں نہ ترمیم کی گنجائش ہے نہ اصلاح کی۔"

(خطبات جمعہ و عیدین)

مطبوعہ زمزم ایجنسی لاہور

مولانا آزاد نے دینِ اسلام میں ترمیم و تغیر کو ناممکن العمل قرار دینے کے بعد مسلمانانِ ہند کو ایک اہم اور بنیادی مشورہ دیا ہے۔

"دوسری قوموں کو اگر زندہ رہنے کے لئے اپنے اپنے مذاہب میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی شریعت کو اور مضبوط پکڑیں اور قوانین اسلام کی شدت سے پیروی کریں۔ دوسری قوموں کی فلاح و بہبود اپنے مذہب سے دوری اختیار کرنے میں ہے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا راز اپنے مذہب سے گرویدگی اور اتباع کامل میں مضمر ہے۔

لیکن مسلمان اپنے مذہب سے بُعد اختیار کر رہے ہیں اور جو شے ان کی ترقی بہبود و فلاح کی ضامن ہے اس سے روگردانی کر رہے ہیں۔"

(خطبات جمعہ و عیدین)

مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں حکومت برطانیہ کو مخاطب کر کے صاف صاف فرما دیا تھا۔

"گورنمنٹ کو بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر ہم مسلمان سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لئے مفید ہوں گے اتنا ہی گورنمنٹ کے لئے نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لئے۔ اس کو بھولنا نہیں چاہئے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ۔۔ یا۔۔ ریوالور نہیں پکڑ سکتا۔"

مزید فرمایا۔

"پس گورنمنٹ کی بھی مصلحت یہی ہونی چاہئے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لئے چھوٹ دے کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لئے نیز تمام عالم کے لئے یکساں طور پر ایک مفید ہستی ہو سکتے ہیں۔"

(الہلال ستمبر ۱۹۱۲ء)

برطانیہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کے دین و مذہب میں عدم مداخلت کے وعدہ کے باوجود جب مداخلت کی تو مولانا آزاد بول پڑے تھے۔

"گورنمنٹ صرف اپنے فوائد و اغراض ہی سامنے رکھ کر غور کرے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور آخرت کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہیں ایک ایسی اٹل اور لاعلاج کش مکش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہیں اور دوسری طرف برٹش گورنمنٹ اور دونوں باتیں اس طرح آپس میں لڑ گئی ہیں کہ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر انسان کے ہاتھ اشارے کر کے طوفان اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح سمندر کے کنارے کھڑی

ہے جو اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو۔ فی الحقیقت یہ نہ تو کوئی اُلجھاؤ ہے اور نہ کوئی مشکل مسئلہ بالکل صاف اور سیدھی بات ہے بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کا نشہ چند لمحوں کے لئے عقل و انصاف کا کام کرنے دے۔ مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیر درس و تدریس رہتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہیئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے اُن کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنیاد پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہو جانے پر مجبور ہو جائیں۔ یا ـــ پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی، اس کو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیئے اگر ایسا کرنے سے مسلمانوں کے مذہبی احکام منہدم ہوتے ہیں تو ہوں اگر ان پر طرح طرح کے اشد فرائض عاید ہو جاتے ہیں تو ہوا کریں ان کو ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار غلام بنا رہنا چاہیئے اگرچہ اس کی خاطر اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہو جانا پڑے ـــ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے بھی آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و فغان میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کر لیں۔"

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب طبع ثانی)

مولانا آزاد کے منقولہ بالا بیانات بالکل واضح ہیں ان کو سمجھانے کے لئے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ بیانات اگر ایک طرف مسلم عوام کی رہنمائی کر رہے ہیں تو دوسری طرف مسلم دانشوروں کے لئے بھی مینارۂ ہدایت ہیں ـــ نیز ـــ ارباب اقتدار اور عدلیہ کے ذمہ داران کو

بھی اسلامی موقف سمجھانے میں ممد و معاون ہیں ـــ مولانا آزاد کو تو یہ ساری باتیں برٹش گورنمنٹ کے سامنے کہنی پڑی تھیں مگر افسوس ہے کہ آج ہم کو یہی ساری باتیں خود اپنی ہندوستانی گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنی پڑ رہی ہیں ـــ برٹش گورنمنٹ کے سامنے یہی سارے احتجاجات تھے جس نے اس جابر و ظالم حکومت کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرح یکساں سول کوڈ کا قانون نافذ کرے جس کے نتیجے میں باوجود خواہش رکھنے کے وہ اس کام کو معرض التواء میں ڈالتی رہی ـــ مگر ـــ بایں ہمہ برطانوی گورنمنٹ اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں سے باز نہ رہی اور ۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ اور بعد میں زمینداری ایکٹ کے ذریعہ اسلامی قانون میں مداخلت کی راہ نکالی ـــ لیکن ـــ یہ علمارِ ملت اِسلامیہ کی ہدایات اور خود مسلمانوں کے اسلامی ضمیر کی روشنی تھی جس کے سبب مسلمانوں کی اکثریت نے اس قانون کو نظر اعتبار سے نہیں دیکھا اور اپنا سارا معاملہ اسلامی شریعت کی روشنی میں انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اگر شاذ و نادر کوئی لڑکیوں کو حقوق دینے کا منکر ہوا تو اُسے اسلامی معاشرہ میں ذلیل نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ـــ یہاں تک کہ ایسے بھی اسلامی خاندان کی مثالیں موجود ہیں جن کے کسی فرد نے اگر لڑکیوں کا حق دینے سے انکار کیا تو اُسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرنے تک کی اجازت نہیں دی گئی

سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ اور شریعت اسلامیہ

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کو باوزن بنانے کے لئے قرآنی ارشادات کو بطور سند پیش کیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عدالت عالیہ کا فیصلہ اسلامی قانون سے ہٹ کر نہیں ہے لہٰذا اس فیصلے سے اسلامی قانون پر آنچ نہیں آتی ـــ عدالت عالیہ کے اس طرز عمل نے ایک دوسری بحث کی داغ بیل ڈال دی ہے وہ یہ کہ عدالت عالیہ کا فیصلہ قرآنی ہدایات کے مطابق ہے کہ نہیں؟ دونوں پہلوؤں پر مسلم دانشوروں نے اظہار خیال شروع کر دیا۔ کوئی اِس فیصلے کو قرآنی ہدایات کے بالکل مطابق قرار دے رہا ہے اور کوئی اسی کو مداخلت فی الدین کا نام دے رہا ہے ـــ احادیث نبویہ کی وضاحتوں کو نظر انداز کر کے اور ائمہ مجتہدین کے ارشادات سے آنکھیں چرا کر براہِ راست قرآن کریم سے مسائل کا اِستخراج وہ بھی عبداللہ یوسف علی

ڈاکٹر خادم رحمانی نوری، محمد رمیڈیوک پکتھال اور آرتھر آربیری وغیرہ کے ترجموں کے بل بوتے پر ہندوستان کی عدالت عالیہ کی وہ کوشش ہے جسے بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جا سکتا۔ جس بات کو علماء راسخین سے سمجھنا چاہئے اُسے وکلاء سے سمجھنا جس حقیقت کو احادیث و تفاسیر کی روشنی میں دیکھنا چاہئے اُسے ایسوں کے ترجموں سے دیکھنا جنھیں فقہ و کلام، تفسیر و حدیث اور دوسرے علوم قرآنیہ میں قابل اعتماد و لائق اعتبار بصیرت نہ ہو عدالت عالیہ کے لئے مناسب نہ تھا بعض مسلم دانشوروں کی ایسی بھی تحریر نظر سے گزری ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عدالت عالیہ کے فیصلے کو بالکل مناسب سمجھتے ہیں اور اس کو اسلامی لاء کے خلاف نہیں تصور کرتے بلکہ وہ یہاں تک کہہ گئے۔

"جہاں تک اس فیصلے کا تعلق ہے اس میں یہ کہہ دینا کہ عورت کو نان و نفقہ ملنا چاہئے میری رائے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ جتنا بہت مجھے قرآن کا علم ہے وہاں پر کہیں بھی ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ جس سے یہ کہا جائے کہ طلاق شدہ عورت کو جس نے دوسری شادی نہیں کی ہے اپنے شوہر سے نان و نفقہ حاصل کرنے کا اختیار نہ ہو گا"

(ہفت روزہ نئی دنیا، تا ۱۳ مئی ۱۹۸۵ء)

آگے چل کر یہی صاحب فرماتے ہیں۔

"میں نے بہت سے علماء سے پوچھا کہ مجھے قرآن کی کوئی ایسی آیت دکھائیں جس میں کہ صاف کہا گیا ہو کہ طلاق شدہ عورت کو اگر کوئی نان و نفقہ دیتا ہے تو وہ حرام ہو گا" (ایضاً)

جس فاضل وکیل نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے اس نے اس خاص بات کی طرف توجہ نہیں فرمائی کہ کسی کا کسی کو اپنی رضا و خوشی سے کہہ دینا یہ اور بات ہے اس کے لئے مطلقہ غیر شادی شدہ کی کیا تخصیص اگر وہ شادی شدہ بھی ہو جائے جب بھی پہلا شوہر اپنی مرضی سے اُسے جو چاہے دے دے۔ مگر ــــ کسی سے کسی کا ناحق جبراً قانوناً کچھ وصول کرنا یہ ایک دوسری چیز ہے اور اس طرح وصول کی ہوئی چیز وصول کرنے والے کے لئے قطعی حرام ہے

ــــ اور یہاں کا معاملہ ایسا ہی ہے اس لئے کہ شاہ بانو کو اسکے سابق شوہر محمد احمد نے اپنی مرضی سے کچھ دینا منظور نہیں کیا ہے بلکہ شاہ بانو نے خود بزورِ عدالت اس کو کچھ دینے پر مجبور کیا ہے ۔ لہٰذا ۔۔ اب بجبر عدالت یہ جو کچھ شاہ بانو کو دے گا وہ قطعی طور پر شاہ بانو کے لئے حرام ہو گا۔ قرآن کریم کی نص صریح ہے کہ۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ) ــــ اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لئے پہونچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھالو جان بوجھ کر ــــ تفسیر قرطبی جزء ثانی ص ۳۳۸ پر اسی آیت کریمہ کے تحت ہے۔ الخطاب بهذه الآية يتضمن جميع امة محمد صلى الله عليه وسلم والمعنى لا يأكل بعضكم مال بعض بغير حق فيدخل فى هذا القمار والخداع والغصوب وجحد الحقوق وما لا تطيب به نفس مالكه او حرمته الشريعة وان طابت به نفس مالكه كمهر البغى وحلوان الكاهن واثمان الخمور والخنازير وغير ذالك ــــ اس آیت کریمہ سے خطاب ساری امت محمدیہ کو شامل ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہارا بعض تمہارے بعض کے مال کو ناحق نہ کھائے تو اس میں وہ سارے اموال داخل ہو جائیں گے جو جوا، مکر و فریب، غصب اور کسی کا حق انکار کر دینے سے حاصل ہوں ــ نیز ــ وہ مال بھی داخل ہو گا جس کو اس کے مالک کی مرضی و خوشی کے بغیر حاصل کیا گیا ہو اور وہ مال بھی داخل ہو گا جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہو خواہ مال والا دینے پر راضی ہی ہو مثلاً خدا کی نافرمانی و سرکشی کا بدلہ، کاہنوں کی اجرت، شراب و خنزیر کی قیمت وغیرہ ــــ آگے چل کر اسی تفسیر میں ہے ــــ من اخذ مال غيره لا على وجه اذن الشريعة فقد اكله بالباطل ومن الاكل بالباطل ان يقضى القاضى لك وانت تعلم انك مبطل فالحرام لا يصير حلالاً بقضاء القاضى ولانه انما يقضى الظاهر وهذا اجماع فى الاموال ــــ جس نے اذن شریعت کے بغیر کسی کا مال لے لیا تو اس نے یقیناً حرام خوری کی۔ ناحق کھانا اور حرام خوری یہ بھی ہے کہ کوئی قاضی سے اپنے حق میں فیصلہ کرالے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے مطالبے میں ناحق

ہے اس لئے کہ قاضی کے فیصلے سے حرام حلال نہیں ہوجاتا کیونکہ قاضی تو ظاہر ہی دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ اموال کے تعلق سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس پر تمام علماء و ائمہ کا اجماع ہے ——— خود سرکارِ رسالت کا ارشاد ہے " لا یحل لامرء مال اخیه الا بطیب نفسه "۔ کسی مرد کے لئے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک خود وہ بھائی بخوشی اُسے نہ دے ——— طوالت تحریر سے بچنے کے لئے اس سلسلے میں صرف اسی قدر پر اکتفا کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ فاضل وکیل کے مطالبۂ نص صریح کی ضرورت اس سے پوری ہو گئی ہوگی ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ہر غریب اور لاچار کی مدد یہاں تک کہ پڑوسیوں کے حقوق بھی واجب کئے ہیں مگر کن پر واجب کئے ہیں؟ کن حالات میں واجب کئے ہیں؟ کتنا واجب کئے ہیں؟ ان امور کے رہنما اصول بھی متعین فرما دیئے ہیں اور زکوٰۃ و صدقات واجبہ ——— نیز ——— صلہ رحمی و انفاق فی سبیل اللہ کے فطری ضابطوں کی وضاحت فرما دی ہے تاکہ کسی غربت کے مارے ڈاکو اور بھوک کے ستائے چور کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ اپنے کروڑپتی پڑوسی یا عزیز کے گھر میں ڈاکہ ڈالے اور چوری کرے اور اسی قدر چرائے جو اس کی فوری ضرورت کو پورا کردے اور پھر کہے کہ ایک کروڑپتی کے گھر سے چند سکّے چرا لینے سے اس کا کیا بگڑتا ہے اور مجھ غریب کا پیٹ بھر جاتا ہے اور بھلا اسلام میرے اس عمل کو کیسے بُرا کہے گا جو کہ اپنے ماننے والوں پر غریب اور لاچار کی مدد یہاں تک کہ پڑوسیوں کے حقوق بھی واجب کرتا ہے ——— ظاہر ہے کہ فاضل وکیل کے نزدیک بھی چوروں اور ڈاکوؤں کی مذکورہ دلیل ناقابل سماعت بلکہ واجب الرّد ہی ہوگی ——— بس ——— اسی طرح شاہ بانو کا مطالبہ غیر شرعی اور واجب الرّد ہے اب اگر عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے تو اس کا یہ فیصلہ حرام کو حلال نہیں بنا سکتا ———

——— اب فاضل وکیل اور ان کے سوا ان کے دوسرے ہم خیال دانشوروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اوّلاً شرعی دلیل سے یہ ثابت کریں کہ " طلاق یافتہ عورت کو تا عقدِ ثانی بنام نان و نفقہ کچھ دینا اس کے سابق شوہر پر واجب ہے "، اس سلسلے میں صرف قرآن کریم ہی کی وضاحت کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ قرآن و حدیث، اجماع امّت و قیاس مجتہدان چار شرعی دلیلوں میں سے کسی بھی دلیل سے مذکورہ بالا وجوب ثابت کیا جا سکے تو ضرور کیا جائے ——— اور اگر نہ ثابت

کیا جا سکے تو پھر قرآن کریم کی کسی آیت کی ایسی تعبیر پیش کرنی ایمانی و اسلامی ذہن کو گوارا نہیں کرنا چاہئے جو چودہ صدی سے زیادہ طویل و عریض عرصے میں کسی اسلام کی معتبر و معتمد شخصیت کے ذہن میں نہ آسکی۔ صحابہ و تابعین ائمہ مجتہدین، علمائے صالحین اور اولیاء کاملین کے ارشادات میں جس کا وجود نہیں ملتا یہاں تک کہ خود صاحب شریعت سرکارِ رسالت مآب سے بھی مروی و منقول نہیں ——— المختصر ——— دفعہ ۱۲۵ کا جبری قانون مسلمانوں کے لئے قطعی طور پر مداخلت فی الدین ہے کریمنل لاء اور پرسنل لاء کی تفریق سے جس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مداخلت بہرحال مداخلت ہے خواہ اس کا آغاز پہلے سے ہوا ہو یا آج سے ہو رہا ہو۔

عہد حاضر کے دانشور، مطلقہ، نان و نفقہ اور اسلامی فقہ

سپریم کورٹ کے فیصلے میں یا بعض دانشوروں کی تحریروں میں دفعہ ۱۲۵ کی تائید میں جن آیتوں کو بطور استشہاد پیش کیا گیا ہے ان کی منقول و ماثور وضاحت اور متواتر و متوارث تعبیر پیش کر دینی بھی مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ عام اسلامی ذہن عہد حاضر کے کسی فریب کا شکار نہ ہو ——— پہلے یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ ہر وہ عورت مطلّقہ ہے جس کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو خواہ طلاق رجعی دی ہو یا طلاق بائن یا طلاق مغلّظ خواہ ایک طلاق دی ہو ——— یا ——— دو ——— یا ——— تین ——— طلاق دیتے ہی وہ مطلّقہ ہو جائے گی اس کے مطلّقہ ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پہلے عدّت گزر جائے پھر وہ مطلّقہ ہو۔ ایک طلاق کے بعد ہی اس کی عدّت کے ایّام شروع ہو جائیں گے ——— لہٰذا ——— وہ لوگ غایت جہل کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ عدّت کی مدّت میں طلاق یافتہ عورت مطلّقہ نہیں ہوتی بلکہ عدّت کے گزر جانے کے بعد اس پر مطلّقہ کا اطلاق صحیح ہوگا ——— یہ خیال لغۃً، شرعاً، عرفاً اور عقلاً ہر طرح باطل ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ قرآن کریم میں تفسیر بالرائے کی ناپاک جسارت کی راہ نکالی جائے ——— ان نادانوں کو یہ روایت بھی نہیں پہونچی کہ جب فاطمہ بنت قیس نے یہ روایت کی کہ میرے شوہر نے مجھے تین طلاق دے دیا اس کے باوجود نبی کریم نے میرے لئے نان و نفقہ اور جائے رہائش واجب نہیں فرمائی۔ حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت اسامہ بن زید،

حضرت جابر اور حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) نے جب اس خاتون کی یہ روایت سماعت فرمائی تو اُسے رد فرما دیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں لا ندع کتاب ربّنا ولا سنة نبینا بقول امرأة لا ندری أصدقت ام كذبت حفظت ام نسيت فانّی سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلّم يقول للمطلقة الثلث ـــــ النّفقة والسكنىٰ مادامت فی عدّتها ـــــ یعنی ہم اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنّت ایک عورت کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے نہ جانے وہ سچ کہتی ہے یا غلط اُسے یاد بھی ہے یا بھول گئی کیونکہ میں نے خود اللہ کے رسول کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تینوں طرح کی طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ان کی عدّت کی مدّت میں نفقہ و جائے سکونت دونوں ان کے سابق شوہروں پر واجب ہیں ـــــ اس ارشاد رسول میں مادامت فی عدّتها۔ اور المطلقة الثلث کے کلمات طیّبات اس بات کی مکمّل وضاحت کر رہے ہیں کہ عدّت کی مدّت کے اندر ہی طلاق یافتہ مطلّقہ ہو جاتی ہے اور نصوص میں مطلّقات کے تعلّق سے جو حقوق ان کے سابق شوہروں سے وابستہ کئے گئے ہیں وہ صرف عدّت کی مدّت تک ہی کے لئے ہیں ـــــ ایسی صورت میں قرآن کریم میں مذکور " للمطلّقات متاعٌ " کے لفظ مطلّقات کا مصداق ان طلاق یافتہ خواتین کو قرار دینا جو عدّت کی مدّت گزار چکی ہوں اور پھر عدّت کی مدّت کے بعد بھی ان کے لئے نان و نفقہ کا وجوب ثابت کرنا قرآن کریم کی شرمناک معنوی تحریف ہے ـــــ ان نادانوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ عدّت کی مدّت گزارنے کے بعد جن طلاق یافتہ خواتین کو از روئے لغت جن معنیٰ میں ان کے سابق شوہروں کی مطلّقہ کہا جا رہا ہے اس معنیٰ میں تو وہ دوسری شادی کر لینے کے بعد بھی اپنے سابق شوہروں کی مطلّقہ ہی کہی جائیں گی ـــــ تو جب وہ دوسری شادی کے بعد بھی سابق شوہروں کے اعتبار سے مطلّقہ ہی رہیں تو پھر " للمطلّقات " کے عموم سے انھیں کیوں نکال دیا گیا اور ان کا نان و نفقہ پہلے شوہروں پر کیوں نہیں واجب کر دیا گیا ـــــ جس شرعی دلیل سے شادی شدہ مطلّقات ارشاد قرآنی کے للمطلّقات کے عموم سے خارج ہیں بالکل اسی دلیل سے عدّت والیاں بھی عدّت گزار لینے کے بعد للمطلقات کے عموم سے خارج ہیں ـــــ اب اگر کوئی یہ سوچے کہ

شوہر والیاں باسہارا اور بے شوہر والیاں بے سہارا ہوتی ہیں اس لئے دونوں کے حکم میں فرق ہونا چاہئے تو یہ سوچنا صحیح نہیں اس لئے کہ میں اس کو واضح کر چکا ہوں کہ اسلامی لا میں بے شوہر والیاں بھی بے سہارا نہیں کیونکہ اس صورت میں ان کے رشتہ داروں پر ان کے نان و نفقہ کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے ـــــ جس محرف قرآن کی غایت جہل کی بات میں نے ابھی کی ہے اس نے اپنے مکتوب مطبوعہ ہفت روزہ "نئی دنیا" ۱۸ تا ۲۴ جون ۱۹۸۵ء ص ۱۵ میں آیت ۲۴۱/۲ کے مفہوم کو ظاہر کرنے میں بھی تحریف سے کام لیا ہے اور اسی مکتوب میں اس کے سوا بھی کچھ جاہلانہ گفتگو کی ہے۔ اگر اپنے خاص موضوع سے بہت دور ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس پر بھی سیر حاصل بحث کرتا۔ یہاں اپنے قارئین سے صرف اتنی گزارش ہے کہ وہ اس آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے ان تفاسیر کا مطالعہ کریں جنھیں علمائے ملّت اسلامیہ کا اعتماد حاصل ہو چکا ہے ـــــ اس بحث کو یہیں ختم کر کے قارئین کرام کی توجّہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ طلاق والی عورتوں کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ جن کا مہر بھی مقرر ہوا ہو اور بعد صحبت طلاق دی گئی ہو۔
۲۔ وہ جن کا مہر مقرر نہ ہوا ہو اور بغیر صحبت طلاق دی گئی ہو۔
۳۔ وہ جن کا مہر مقرر ہوا ہو مگر صحبت کے بغیر طلاق دی گئی ہو۔
۴۔ وہ جن کا مہر تو مقرر نہ ہوا ہو مگر صحبت کے بعد طلاق دی گئی ہو۔

پہلی قسم کی مطلّقات کا قرآنی حکم یہ ہے کہ ان کو پورا مہر دیا جائے اور وہ تین قروء عدّت گزاریں چنانچہ ارشاد ہے وَ اٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء) اور دے ڈالو عورتوں کو ان کا سارا مہر خوش خوش ـــــ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء) تو جب تم نے ان سے نفع اٹھانا چاہا تو دے ڈالو ان کو ان کا معاوضہ مقررہ ـــــ نیز ـــــ ارشاد ہے وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اور طلاق والیاں اپنی جانوں روکے رہیں تین حیض تک ـــــ دوسری قسم کی مطلّقات کے لئے قرآنی حکم یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی مہر نہیں بلکہ صرف ایک جوڑا دینا واجب ہے جیسا کہ ارشاد ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً

وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ـــــ یعنی تم پر کچھ مطالبہ نہیں اگر تم عورت کو طلاق دو جب تک تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔ یا ـــ کوئی مہر مقرر نہ کر لیا ہو اور ان کو کچھ برتنے کو دو مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگ دست پر اس کے لائق حسب دستور کچھ برتنے کی چیز یہ واجب ہے بھلائی والوں پر ـــــ حاصل ارشاد یا تو یہ ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم اپنی بیوں کو بغیر صحبت اور بغیر مہر مقرر کئے طلاق دو تو تم پر مہر واجب نہیں ہاں اس صورت میں تم انھیں کپڑے کا ایک جوڑا دے دو مالدار پر تو اپنی حیثیت کے موافق قیمتی جوڑا واجب ہے اور تنگدست پر اس کے لائق معمولی جوڑا خوش دلی کے ساتھ اچھے طریقے سے دو نہ کہ تنگ دِل ہو اور لڑائی جھگڑے سے ـــ بھلائی والوں پر یہ واجب ہے ـــ یا یہ کہ ـــ اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو تو تم پر مہر کا مطالبہ نہیں مگر جب کہ بوقت نکاح تم نے مہر مقرر کر لیا ہو تب دینا پڑے گا ـــ یا یہ کہ۔ جب تک تم نے عورتوں سے صحبت نہ کی ہو یا ان کے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تب تک تمہیں طلاق دینے میں کوئی گناہ نہیں جس حالت میں چاہو طلاق دے دو الخ۔ ـــــ تیسری قسم کی مطلّقات کا قرآنی حکم یہ ہے کہ اُنھیں مقررشدہ مہر کا آدھا دینا واجب ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوے طلاق دیدی اور ان کے لئے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے ضمن میں آنے والی مطلّقات کے لئے عدّت نہیں ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ۔۔ ـــ چوتھی قسم کی مطلّقات کا قرآنی حکم یہ ہے کہ ان کو مہرِ مثل دینا واجب ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ تو جب تم نے ان سے نفع اٹھانا چاہا تو دے ڈالو اُن کا معاوضہ ـــــ ایسوں کے لئے مہر مثل کا ثبوت اس ارشاد سے زیادہ واضح اس حدیث سے ہے جس کو ابوداؤد ج۔ ا میں "بَاب مَنْ تَزَوَّجَ وَلَمْ يُسَمِّ صَدَاقًا" کے تحت ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جس عورت کا مہر مقرر نہ ہوا ہو اس کے

بارے میں مہر مثل کا فیصلہ بر بنا قیاس فرمایا تو اس موقع پر حضرت جرّاح اشجعی اور حضرت ابوسنان (رضی اللہ عنہما) نے کہا کہ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ بروع بنت واشق کے مقدمہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہی فیصلہ فرمایا تھا اسے سُن کر حضرت ابن مسعود بے حد مسرور ہوئے ـــــ اس مختصر سی تفصیل کے بعد عدّت والیوں کی مدّت ـــ نیز ـــ ان کے نان و نفقہ کے تعلّق سے قرآنی ہدایات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے ـــ عدّت کی دو قسمیں ہیں ایک عدّت موت دوسری عدّت طلاق۔ وہ خاتون جس کا شوہر وفات کر گیا ہو اس کے نفقہ کے تعلّق سے ابتدائً خداوندی ہدایت یہ تھی کہ "جس شخص کی موت قریب ہو اور وہ بیوی والا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو اپنی بیوی کے تعلّق سے وصیت کر جائے کہ وہ اس کے مال سے مکمّل ایک سال تک اس کی بیوی کو نان و نفقہ دیتے رہیں اور سال کے آخر تک اس کی بیوی کو اس کے گھر ہی میں رہنے دیں" ـــــ اس ارشاد میں دو ہدایتیں تھیں ایک تو عدّت کے پورے سال عورت کا اپنے شوہر کے گھر میں خود کو روکے رکھنا ـــ اور دوسرے شوہر کے مال سے پورے سال کے لئے اس کی رہائش اور نان و نفقہ کا انتظام کرنا ـــــ آغاز اسلام میں اس پر عمل بھی تھا۔ چونکہ اس وقت وفات یافتہ کی بیوی کی عدّت کی مدّت مکمّل ایک سال تھی اسی لئے نان و نفقہ وغیرہ کی ذمّہ داری بھی پورے ایک سال کے لئے رہی سال پورا ہو جانے کے بعد ذمّہ داری بھی ختم ہو گئی ـ مگر ـــ یہ آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا نازل فرما کر سابقہ مدّتِ عدّت کو منسوخ فرما دیا گیا ـ نیز ـ شوہر کے ترکہ میں چوتھا یا بصورت دیگر آٹھویں حصّہ کا حقدار بنا کر مدّتِ عدّت کے نان و نفقہ کی ذمّہ داری سے بھی سبکدوش فرما دیا گیا۔ یہ خیال رہے یہ آیت ناسخہ گو تلاوت میں مقدّم ہے لیکن نزول میں مؤخر ہے جس پر جملہ تفاسیر شاہد عدل ہیں ـــــ عدّت والیاں خواہ عدّت وفات والی ہوں یا عدّت طلاق والی دونوں کی عدّتوں کی مدّتوں کی تعیین و تحدید میں جو نصوص ہیں وہ اپنے عموم کے لحاظ سے حاملہ و غیر حاملہ دونوں کو شامل تھیں ـــ لیکن ـ حضرت عبداللہ ابن مسعود کے ارشاد کی روشنی میں حاملہ عدّت والیوں کے حق میں

اس عموم کی تنسیخ یا تخصیص ان آیات کریمہ سے ہو گئی جو خاص کر کے حاملہ عدّت والیوں کی عدّت کی مدّت کی تعیین و تحدید کے لئے نازل فرمائی گئی۔ اور وہ یہ ہیں۔ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق) حاملہ عدّت والیوں کی عدت کی مدّت وضع حمل تک ہے۔ نیز ارشاد ہے۔ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ یعنی اگر عدّت والی حاملہ ہو تو اس کی کفالت بچّہ کی ولادت تک شوہر کے ذمّہ واجب ہو گی۔ لفظ حتّیٰ کا مفاد یہی ہے کہ وہ حکم کو خاص مدّت تک محدود کر دے الحاصل یہ آیت اس حکم میں صریح ہے کہ نفقہ کا وجوب وضع حمل (جو حاملہ کی عدّت کی مدّت ہے) تک محدود رہتا ہے مذکورہ عدّت کی مدّت گزر جانے کے بعد شوہر بری الذّمہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب حاملہ کا نفقہ ولادت کے بعد ختم ہو جاتا ہے تو پھر غیر حاملہ کے لئے عدّت کے بعد نفقہ واجب کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں ہو سکتے ——

عدّت والیوں کی عدّت کی مدّت کے سلسلے میں حضرت علی و حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا ارشاد یہ ہے کہ احتیاطاً ابعد الاجلین کو عدّت کی مدّت قرار دینا چاہئے مثلاً اگر حاملہ عدّت وفات والی کا وضع حمل چار مہینے دس دن سے پہلے ہی ہو جائے تو وہ چار مہینے دس دن تک عدّت ہی میں رہے اور اگر وضع حمل چار مہینے دس دن کے بعد ہو تو پھر وضع حمل تک اس کی عدّت ہو گی۔ اس طرح دونوں آیتوں پر عمل ہو جاتا ہے ——

—— مندرجہ بالا تحقیقات سے چند باتیں واضح طور پر سامنے آگئیں۔

۱؎ مطلّقات کی کل چار قسمیں ہیں جن میں عدّت و نفقہ و مہر وغیرہ کے اعتبار سے ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

۲؎ شوہر کی طرف سے نفقہ عدّتِ طلاق صرف عدّت والی مطلّقات کے ساتھ مخصوص ہے۔

۳؎ عدّت کا وجوب صحبت و قربت کے بعد ہی ہوتا ہے۔

۴؎ شوہر پر کل مہر مقررہ — یا — بصورت دیگر مہر مثل کی ادائے گی اسی وقت لازم ہے جبکہ حقیقتاً یا حکماً بیوی سے صحبت و قربت ہو چکی ہو۔

۵؎ مہر مقرر ہونے کی صورت میں بھی اگر صحبت و قربت نہیں ہوئی تو صرف نصف مہر دینا واجب ہو گا۔ تو اب اگر لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ کا معنیٰ یہ ہو کہ متعہ اس مطلّقہ کے

لئے واجب ہے جسے قبل خلوت طلاق دے دی گئی ہو خواہ اس کا مہر مقرر کیا گیا ہو (جیسا کہ ایک قول اس کا بھی کیا گیا ہے) تو پھر یہ آیت تیسری قسم کی مطلّقات کے تعلق سے ذکر کردہ ارشاد ربّانی سے منسوخ ہو گی۔

۶؎ ایسی منکوحہ جس کا نہ تو مہر مقرر کیا گیا ہو اور نہ اس سے صحبت کی گئی ہو اس کے لئے نہ عدّت ہے اور نہ مہر — ہاں — اس کو صرف متعہ دینا واجب ہے۔

۷؎ نفقہ عدّت کا تعلّق چونکہ عدّت سے ہے لہٰذا جس کے لئے عدّت نہیں اس کے لئے نفقہ نہیں — یوں ہی — جس کی عدّت ختم ہو گئی اس کے نفقہ کی ذمّہ داری بھی ختم ہو گئی۔

۸؎ جن نصوص سے مذکورہ بالا امور ثابت ہیں وہ اپنے مفہوم و معنیٰ میں صریح ہیں محتمل و مبہم نہیں، محکم ہیں مؤوّل نہیں، مفصّل ہیں مجمل نہیں —— ان حالات میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اگر کوئی ایسی نص سامنے آئے جو صریح و محکم و مفصّل نہ ہو بلکہ اس میں مختلف تاویلات و احتمالات کی گنجائش ہو تو اس کی وہی تاویل و تفصیل اور اس کا وہی احتمال قابل قبول اور صحیح و درست ہو سکتا ہے جو نصوص صریحہ غیر مبہمہ و محکمہ و مفصّلہ سے متعارض و متصادم نہ ہو۔ لہٰذا ہر ذی فہم مفسّر قرآن کے لئے لازمی ہے کہ وہ ہر نص ماوّل کی تاویل اور نصِّ مبہم کا ابہام نص صریح کی روشنی میں کرے — نیز — ہر نص مجمل کی تفصیل نص مفصّل کے سائے میں اور ہر نص محتمل کی تشریح نص محکم کی نگرانی میں کرے — اس بحث کے آخر میں اس خاص آیت کریمہ کے متوارث و متواتر مفہوم و معنیٰ کی وضاحت ضروری ہے جس کو سمجھنے میں بعض دانشوروں سے بھی چوک ہو گئی ہے۔ اس چوک کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے نصوص صریحہ سے آنکھیں چرا کر صرف اپنے فہم و ادراک کی بنیاد پر معنیٰ آفرینی کی کوشش کی ہے وہ آیت کریمہ یہ ہے — وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ — اس آیت کریمہ کے معنیٰ مراد کی تعیین میں متعدد احتمالات ہیں۔

۱؎ مطلّقات سے مراد وہ طلاق یافتہ خواتین ہیں جو عدّت والیاں ہیں اور متاع سے مراد نفقہ عدّت ہے اور حقًّا کا لفظ وجوب کے لئے ہے اب آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ مطلّقات جن پر عدّت لازم ہے عدّت کی مدّت تک ان کے سابق شوہروں کو انھیں نان و نفقہ

وجائے رہائش دینا واجب ہے۔ صاحب مدارک کا مختار یہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک بھی آیت کریمہ کا یہی معنیٰ ہے۔ اس صورت میں متاع بالمعروف سے سابقہ آیات میں ذکر کردہ نفقات واجبہ کے حکم کی تاکید مقصود ہے۔

۲۔ مطلّقات سے مراد صرف وہ طلاق یافتہ خواتین ہیں ماسبق آیات میں جن کا ذکر نہیں یعنی وہ عورتیں جن کا مہر مقرر کیا جا چکا ہو اور بعد صحبت طلاق دی گئی ہو اور آیت کریمہ استحباب پر محمول ہو تو اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اس نمبر۲ میں جس طرح کی عورتوں کا ذکر ہے ان کو کل مہر مقررہ اور عدّت کی مدّت میں نفقہ و رہائشی مکان دینا تو واجب ہی ہے اس کے سوا طلاق دینے کے بعد برائے دلجوئی و دلداری فوراً متعہ دینا مستحب ہے۔ اس صورت میں آیت میں مذکور لفظ "حق"، شرعی و قانونی وجوب کے بجائے اخلاقی وجوب کے معنیٰ میں ہوگا جیسا کہ خود قرآن کریم میں جابجا اس کو اخلاقی وجوب کے معنیٰ میں استعمال فرمایا گیا ہے مثلاً وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج) جن کے مالوں میں سائلین و محرومین کے لئے مقرّرہ حق ہے۔ چونکہ یہ آیت مکّی ہے اور زکوٰۃ کی فرضیت اپنے متعینہ نصاب کے ساتھ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اس لئے حضرت ابن عبّاس، حضرت عبداللہ ابن عمر اور امام مجاہد و شعبی کے نزدیک اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اہل ایمان خود ہی اپنے مالوں میں اہل حاجت لوگوں کا حصّہ مقرر سمجھتے تھے لہٰذا یہاں "حق" کا لفظ قانونی وجوب کا مفہوم نہیں دے رہا ہے — یوں ہی — سورۂ ذاریات میں آخرت کی حکایت کرتے ہوئے کہا گیا ہے وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور یہ نکوکار لوگ اپنے مالوں میں سائل و محروم کا حق سمجھتے تھے۔ اس آیت میں "حق" کی صفت "معلوم و مقرر" نہ لاکر اور بھی واضح کر دیا گیا کہ حق سے مراد قانونی وجوب نہیں — سورۂ اعراف میں فرمایا گیا کہ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ایک جماعت نے ہدایت پائی اور ایک جماعت گمراہی پر ثابت ہو گئی۔ یہاں بھی حق کا لفظ قانونی وجوب کا مفہوم نہیں دے رہا ہے بلکہ ثابت ہونے کا مفہوم دے رہا ہے جو اس کا لغوی مفہوم ہے۔

۳۔ مطلّقات سے مراد صرف وہ خواتین ہوں جن کا نہ تو مہر مقرر کیا گیا ہو اور نہ اُن

سے صحبت و قربت کی گئی ہو۔ اس صورت میں متاع کا معنیٰ متعہ ہے اور لفظ حق قانونی وجوب کے معنیٰ میں ہوگا اس صورت آیت کریمہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اس طرح کی مطلّقات کو طلاق کے بعد فوری طور پر متعہ دینا واجب ہے — تفسیر مظہری اور تفسیر روح المعانی میں صاف لفظوں میں وضاحت فرمائی گئی ہے کہ متعۃ الطلاق صرف ان عورتوں کے لئے ثابت ہے جن کو ہاتھ لگانے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔ تفسیر مظہری سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب آیت "وَمَتِّعُوْهُنَّ — الی — مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ" نازل ہوئی تو ایک شخص نے کہا کہ اگر میں احسان کروں گا تو ایسی مطلّقہ کو کچھ دوں گا اور اگر میرا احسان کرنے کا ارادہ نہ ہوگا تو رخصت کرتے وقت کچھ نہ دوں گا تو اس کے بعد "وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ" نازل ہوئی لہٰذا متعۃ الطّلاق صرف ان عورتوں کے لئے ثابت ہے جن کو ہاتھ لگانے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۴۔ مطلّقات طلاق یافتہ خواتین کی تمام قسموں کو شامل ہے اس صورت میں متاع سے مراد وہ ہے جو ہر طرح کی نفع رسانی کو شامل ہو خواہ وہ کسی کے لئے واجب ہو اور کسی کے لئے مستحب — یا — خواہ وہ کسی کے لئے نان و نفقہ و رہائشی مکان کی صورت میں ہو خواہ متعہ کی شکل میں ہو یا صرف مہر کے رنگ و روپ میں۔ اس صورت میں لفظ حق بھی ایک مفہوم کا حامل ہوگا جو قانونی وجوب اور اخلاقی وجوب دونوں کو شامل ہوگا — المختصر — اس صورت میں لفظ متاع فی الجملہ نفع رسانی ہی کے معنیٰ میں ہوگا — نمبر۳ کے ضمن میں مذکور خواتین کے سوا دوسرے مطلّقات کو متعہ دینے کا استحباب اس آیت سے بھی ہوتا ہے کہ "تَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا" اور ظاہر ہے کہ بہتر طور پر علیحدگی کی ایک اچھی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جوڑا دے کر رخصت کیا جائے تاکہ طلاق سے انھیں جو دل شکنی ہوئی ہے اس دلداری سے اس میں کچھ کمی ہو جائے۔

۵۔ حضرت سعید ابن جبیر، حضرت ابو العالیہ، حضرت حسن بصری کے نزدیک نیز اس سلسلے میں حضرت امام شافعی کا بھی ایک قول ہے کہ آیت زیر بحث میں مطلّقات سے مراد عام ہے جو سبھی طلاق یافتہ عورتوں کو شامل ہے اور لفظ حق قانونی وجوب ہی کے لئے

ہے تو اب ان کے نزدیک ہر طرح کی مطلّقہ عورت کو متعہ دینا واجب ہے مگر متعہ سے مراد اُن کے نزدیک بھی طلاق کے بعد فوراً وقتی نفع رسانی ہے لہٰذا حکم متعہ سے تاحیات ۔یا۔ تا نکاح ثانی نفقہ مراد لینا اور پھر ان کو تمام مطلّقات کے لئے سابق شوہروں پر واجب قرار دینا ان کے نزدیک بھی صحیح نہیں ـــــ آیت زیر بحث کا یہ معنیٰ لینے کی صورت میں احناف کے نزدیک یہ آیت صرف نمبر ۳ والیوں کے لئے محکم ہوگی باقی کے لئے منسوخ ہوگی ـــــ آیت زیر بحث کے مفہوم کی تشریح و تعبیر میں مذکورہ بالا ان پانچ احتمالات پر غور فرمایئے ان میں سے کوئی احتمال بھی ایسا نہیں جو کسی نص صریح سے متصادم و متعارض ہو ـــ نیز ـ کسی احتمال پر یہ الزام بھی نہیں کہ اس میں اپنی ذاتی رائے کو قرآن پر تھوپنا ہے ـــ بلکہ ـــ ہر احتمال مختلف لب و لہجے میں قرآن کریم ہی کی نصوص صریحہ کی تاکید و تشریح پیش کرتا ہے ـــ اس تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ آیت زیر بحث میں لفظ متاع کا مفہوم متعیّن کرنے سے پہلے لفظ مطلّقات کے معنیٰ مراد کی وضاحت لازمی ہے پھر اسی کے مطابق لفظ متاع کا معنیٰ ظاہر کرنا ضروری ہے یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ہماری معنیٰ آفرینی کی کسی نص صریح کے احکام سے متعارض نہ ہونے پائے ـــــ المختصر ـــــ آیت زیر بحث میں مطلّقات سے مراد ہر قسم کی طلاق یافتہ خواتین اور متاع سے مراد تاحیات ـــ یا ـــ تا نکاح ثانی نان و نفقہ اور حق سے مراد قانونی وجوب لے کر آیت کا یہ معنیٰ بتانا کہ ہر قسم کی طلاق یافتہ خواتین کے سابق شوہروں پر واجب ہے کہ وہ اپنی مطلّقہ کو تاحیات ـ یا ـ تا نکاح ثانی نان و نفقہ دیتے رہیں تفسیر بالرائے کی بدترین مثال ہے اور خود اپنی رائے کو قرآن کریم پر تھوپنے کی شرمناک کوشش ہے ـــ اور جو ـــ کتاب و سنّت اور اجماع امّت و قیاس صحیح کے احکامات و ارشادات کی روشنی میں قطعی طور پر باطل ہے ـــ اسلامی فقہ کی پوری تاریخ دیکھ ڈالئے اس میں کسی امام مجتہد کا یہ قول نہیں ملے گا کہ عدّت کے بعد بھی مطلّقہ نان و نفقہ کی مستحق ہوگی ـــ مطلّقہ کے لئے دوران عدّت نفقہ کا وجود ائمہ کے مابین مختلف فیہ ضروری ہے لیکن عدّت کے بعد شوہر پر عورت کے نفقہ کی ذمّہ داری کچھ نہیں ہوتی اس پر تمام علماء اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہے اس لئے عدّت کے بعد شوہر پر نفقہ واجب کرنا اجماع اُمّت کے خلاف ہے ـــــــــــ

ـــــــ ورق الٹ کر دیکھئے میں اپنی جگہ پر واضح کر چکا ہوں کہ نفقہ واجب ہونے کے اسباب تین ہیں۔ ۱ ـ زوجیت ، ۲ ـ نسب ، ۳ ـ ملک ، لہٰذا قیاس صحیح کا بھی تقاضہ یہی ہے کہ جہاں ان اسباب میں سے کوئی سبب نہ پایا جاتا ہو وہاں نفقہ بھی واجب نہ ہو ـــ اس لئے ـ کہ مسلمہ ضابطہ ہے "اَلْاَصْلُ بُرَاءَۃُ الذِّمَّۃِ" اصل یہی ہے کہ کوئی کسی کا ذمّہ دار نہ ہو اب ذمّہ داری کسی معقول سبب کی وجہ ہی سے عائد ہو سکتی ہے ـــ عہد حاضر کے دانشوروں پر خدا رحم فرمائے جو بات قیاس میں نہ آئے بلکہ قیاس صحیح اُسے باطل قرار دے اُسی کو وہ قیاس صحیح کا ثمرہ سمجھ رہے ہیں ـ سچ ہے ـ ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہوں ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

نان و نفقہ ـ دفعہ ۱۲۵ ـ اور مسلم معاشرہ کے کرب و اضطراب کی وجہ؟

مُتْعَۃُ النِّکَاحِ یہ کوئی تاوان نہیں جو مرد پر عائد کیا گیا ہو ورنہ اس کی تعبیر "نکال" سے کی جاتی نہ کہ "متاع" سے ـ متاع کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ علیحدہ ہونے والی عورت کو کسی نہ کسی حد تک اس کی دلدہی اور اشک شوئی کے لئے وقتی طور پر کچھ نفع پہونچایا جائے ـ عربی زبان میں متاع کی حقیقت ہی "النفع الحاضر" ہے یعنی وقتی طور پر نقد نفع رسانی ـ المنجد میں ہے المتعۃ اسم للتمتیع الزاد القلیل متعۃ المرأۃ ما وصلت بہ بعد الطلاق من نحو القمیص والازار والملحفۃ وھی متعۃ الطلاق ـــ یعنی متعہ نفع رسانی کا نام ہے اس کا معنیٰ زاد قلیل ہے ـ عورت کا متعہ وہ چیزیں ہیں جو طلاق کے بعد عورت کو ملتی ہیں مثلاً قمیص پائجامہ اوڑھنی وغیرہ اسی کو متعۃ الطلاق کہتے ہیں ـــــ امام رازی تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۰۷ میں فرماتے ہیں ـ اصل المتعۃ والمتاع ما ینتفع بہ انتفاعاً غیر باق بل منقضیاً عن قریب یعنی متعہ اور متاع وہ نفع بخش اشیاء ہیں جن کی نفع رسانی فوری ہوتی ہے جو باقی رہنے والی نہیں ہوتی بلکہ جلد ختم ہو جانے والی ہوتی ہے ـــ المختصر ـــ متعہ طلاق کے بعد فوری طور پر دی جانے والی چیزوں کا نام ہے لہٰذا مسلسل نامعلوم مدّت تک جاری رہنے والے نفقہ کو اس کا مصداق قرار دینا از رُوئے لُغت بھی صحیح نہیں ـــ یہ بھی سوچنا

چاہئے کہ حضور آیۃ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم جن پر آیات نازل ہوئیں اور صحابہ کرام جو براہ راست مشکوٰۃ نبوّت کے انوار و تجلّیات سے مستفیض و مستنیر ہوئے اور تابعین جو صحابہ کرام سے راست فائدہ حاصل کرنے والے تھے اور ان کے سوا جملہ تبع تابعین ائمہ مجتہدین اور علمائے کاملین ان میں سے آج تک کسی نے "تا نکاح ثانی نفقہ" کو متعہ کا مصداق نہیں سمجھا ہے۔ تو کیا اس سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ آیت کریمہ میں مذکور متاع میں "بعد طلاق تا نکاح ثانی نفقہ" کو داخل کر کے اس کے قانونی لزوم کو تسلیم کرانا عہد حاضر کے متجدّدین کی ذہنی بے راہ روی ہے

—— اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ آخر متعہ کی وہ شرعی مقدار کیا ہے جس کو بعد طلاق دیدینے سے واجب کی ادائیگی سے سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہو۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔

۱۔ اس کی مقدار مرد کی حیثیت پر موقوف ہے خوشحال کے لئے اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست کے لئے اس کی طاقت کے مطابق لہٰذا اس کی کوئی مقدار متعیّن نہیں ہے دونوں کے حالات کا جائزہ لے کر حاکم جو فیصلہ کرے۔ یہاں تک کہ ایک بار ایک انصاری کو نبی کریم نے متعہ میں صرف اس کی اپنی ٹوپی دے دینے کی ہدایت فرمائی تھی ارشاد الٰہی عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ سے بھی اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

۲۔ احناف کے نزدیک متعہ جس کا دینا واجب ہے وہ ایک جوڑا کپڑا ہے جس میں پائجامہ کرتا اوڑھنی تین کپڑے ہوں وہ کپڑے قیمتی ہوں یا سستے اچھے ہوں یا خراب اس سلسلے میں مرد کی حیثیت کو دیکھا جائے گا اگر وہ باحیثیت ہے تو اُسے قیمتی اور اچھے کپڑے دینے ہوں گے اور اگر غریب ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق جیسا کپڑا دے سکے دے دے۔ اس قول کے قائلین کے نزدیک ارشاد الٰہی "عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ" کا رُخ اسی طرف ہے —— اس صورت میں آیت کریمہ للمطلقات متاعٌ الآیہ میں لام تعریف عہد خارجی کا ہوگا جس سے مراد وہی مطلّقات ہوں گی جن کے لئے متعوھن سے حکم وجوبی دیا جا چکا ہے۔ تفسیر مظہری کے حوالے سے للمطلّقات متاع کی شان نزول کی طرف اشارہ کر چکا ہوں اس سے بھی اس معنیٰ کی تائید ہوتی ہے —— ان قائلین کو اس روایت سے بھی تائید

ملتی ہے جس میں بالکل واضح لفظوں میں تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا دینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور جو حضرت عبداللہ ابن عباس اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) دونوں سے مروی ہے۔ زاہدی نے حضرت عبداللہ ابن عباس کا ایک قول یہ بھی پیش کیا ہے۔ اعلاھا الزاد و اقلھا المقنعہ یعنی متعہ کا اعلیٰ (یعنی زیادہ سے زیادہ) زاد ہے اور اس کا اقل (یعنی کم سے کم) اوڑھنی ہے مگر اس سے حضرت ابن عبّاس کے پہلے قول کی تردید نہیں ہوتی بلکہ اس سے اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان اس کے متوسط ہونے کی تائید و توثیق ہوتی ہے —— تفسیر احمدی میں وضاحت ہے کہ مناسب یہ ہے کہ ان تین کپڑوں کی قیمت مہر مثل کے نصف سے زیادہ نہ ہو اور پانچ درہم سے کم نہ ہو اس لئے کہ وہ مطلّقہ جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اگر وہ صحبت یافتہ ہو تو اس کے لئے مہر مثل ہے تو قیاس چاہتا ہے کہ جو صحبت یافتہ نہ ہو اس کے لئے مہر مثل کا آدھا ہو جس طرح کہ وہ مطلّقہ جس کا مہر مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ صحبت یافتہ ہو تو اُسے پورا مہر ملتا ہے اور اگر وہ صحبت یافتہ نہیں ہے تو اُسے مقرّرہ مہر کا آدھا ملتا ہے تو مناسب ترین بات یہی ہے کہ متعہ نصف مہر مثل سے زیادہ نہ ہو۔ اور چونکہ مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے تو پھر متعہ کی بھی کم سے کم مقدار پانچ درہم ہی ہونی چاہئے جو دس درہم کا آدھا ہے۔

۳۔ امام شعبی کہتے ہیں کہ اوسط درجہ یہ ہے کہ ایک کرتا ایک دوپٹہ اور ایک چادر دیدے قاضی شریح پانچ سو دلواتے تھے۔ ایوب بن سیرین سے منقول ہے کہ وہ بطور متعہ ایک خادم کچھ خرچہ کی رقم اور ایک جوڑا کپڑا دیتے تھے۔ حضرت امام حسن علی جدہ وعلیہ السلام دس ہزار اور ایک روایت کی رو سے بیس ہزار بطور متعہ دیتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ادنیٰ متعہ تیس درہم ہیں سیدنا ابن عبّاس سے روایتیں مختلف ہیں دو تو وہی جن کا ذکر اوپر ہو چکا تیسری یہ ہے کہ اعلیٰ متعہ خادم ہے اور اس سے کچھ کم چاندی اور اس سے کچھ کم کپڑے۔ حضرت ابن عبّاس کی مذکورہ بالا صرف تین کپڑے والی روایت کی تائید چونکہ حضرت عائشہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے —— نیز اس میں تعین بھی ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معیّن کے واجب ہونے میں جھگڑا ہو سکتا ہے اسی لئے احناف نے اسی کو اختیار کیا

ـــــــ ٹوپی والی روایت حافظ ولی الدین عراقی کے نزدیک صحیح نہیں صحت مان لینے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ کمال معذوری کے اظہار کے سبب سرکار رسالت نے خاص انھیں انصاری کو یہ رخصت دی ہو جیسے کہ ایک صحابی کے روزے کا کفارہ خود انھیں کو کھلا دیا گیا ـــــــ اسی طرح اس روایت کے تعلق سے جو جمع الجوامع ج ۱ ص ۲۶ میں بحوالہ بیہقی مذکور ہے یعنی " متعہا ولو بنصف صاع من تمر " اسے متعہ دو خواہ نصف صاع کھجور ہی کیوں نہ ہو ـ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے سرکار رسالت نے مامور کے حالات کے پیشِ نظر اس کے لئے یہ خاص حکم فرمایا ہو ـــــــ مذکورہ بالا ان تمام تشریحات و تفصیلات سے چند حقیقتیں کھل کر سامنے آگئیں ۔ ایک تو یہ کہ متعۃ الطلاق کی وہ مقدار کیا ہے جس کے دینے سے واجب ادا ہوجاتا ہے ؟ یہ کن مطلّقات کے لئے واجب ہے ؟ اور کن کے لئے مستحب ؟ یا سب کے لئے واجب ہے ؟ یا بعض کے لئے واجب ہے اور بعض کے لئے مستحب ؟ پھر وہ بعض کون ہیں جن کے لئے واجب ہے ؟ ـــــــ ان امور میں فقہاء وائمہ کا اختلاف قرن اوّل ہی سے چلا آرہا ہے مگر اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں کہ متعۃ الطلاق ایک عطیہ ہے جو طلاق کے بعد ایک ہی بار دیا جاتا ہے اور اس کی حیثیت ایک وقتی نفع رسانی کی ہوتی ہے ـــ نیز ـــ اس سے مطلّقہ کی پوری زندگی کی کفالت مقصود نہیں ہوتی اور نہ ہی عدّت گزارنے کے بعد تاحیات ـ یا ـ تا نکاحِ ثانی مطلّقہ کے لئے یہ کوئی نان و نفقہ ہے بس یہ ایک وقتی دل دہی و دلجوئی کے لئے بطور تحفہ مطلّقہ کو حسب حیثیت کچھ دے دیا جاتا ہے ـــــ
دوسری یہ کہ جن نصوص میں متعہ کے لئے کوئی مقدار معین کردی گئی ہے اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس مقدار سے کم دینے پر واجب ادا نہ ہوگا لیکن زیادہ دینے پر کوئی روک نہیں اپنی رضا و خوشی سے زیادہ دینا بہرحال مستحب ہے ـــــــ تیسری یہ کہ جن کے نزدیک متعہ صرف بعض مطلّقات کے واجب ہے ان کے نزدیک بھی سب کو دینا مستحب ہے جس طرح وہ مطلقہ جس کا مہر مقرر ہوگیا ہو اگر اس کو بغیر ہاتھ لگائے طلاق دے دی جائے تو اسے اس کے مہر مقررہ کا صرف آدھا دینا واجب ہے مگر اگر کوئی پورا دیدے تو یہ بھی یقیناً ایک مستحسن اقدام ہوگا ـــــــ چوتھی یہ کہ مقدار واجب کے سوا بطور

متعہ جبراً زیادہ وصول کرنا غلط و ناجائز بلکہ ایک ظلم ہے اسلام جس کی تائید نہیں کرتا ۔ ہاں ، اگر کوئی خود برضا و رغبت زیادہ دیدے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایک نہایت قابل تعریف و لائق تقلید عمل ہے ـــــــ پانچویں یہ کہ اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوچکا کہ بزرگوں سے بطور متعہ مختلف مقدار کے عطیات دینا منقول و ماثور ہے لہٰذا ثابت ہوگیا کہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ شرعاً وہ کسی خاص مقدار کو (کہ اس سے زیادہ دینا جائز نہ ہو) بطور متعہ دینے کے پابند نہ تھے ـ المختصر ـ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کو اسلام کی کسی بھی معتبر و معتمد شخصیت کا کوئی قول ضعیف بھی سہارا نہیں دے رہا ہے ـــــــ بعض فقہی بصیرت رکھنے والے دانشوروں نے اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے دو باتیں کہی ہیں ـ ایک یہ کہ اگرچہ عام رائے مفسّرین و فقہائے کرام کی یہ ہے کہ تمام مطلّقہ عورتوں کے لئے شوہر پر متاع ـ یا ـ متعہ واجب نہیں بلکہ مستحب کے درجے میں ہے لیکن چند مذکورہ بالا تابعین و ائمہ کرام سب کے لئے اس کے واجب ہونے کے بھی قائل ہیں تو کیا موجودہ زمانے کے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر ان بزرگوں کے قول کو اختیار کرکے اسے وجوباً نافذ کردیا جاسکتا ہے کہ نہیں ؟ جس طرح ہمارے اکابر نے زوجہ مفقود الخبر کے بارے میں امام ابو حنیفہ کے قول کو چھوڑ کر امام مالک کے قول کو اختیار فرمایا ہے اور اس کے مطابق فیصلے ہو رہے ہیں ـــــــ
اور دوسری یہ کہ موجودہ حالات میں جبکہ اسلام کے قانون طلاق کو ظالمانہ قرار دیا جارہا ہو اور اس کے مقابلے میں قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کو پیغام رحمت و سامانِ راحت باور کرایا جارہا ہو ـــ نیز ـــ مطلّقہ عورتوں کو اسلامی لاء اور شریعت اسلامیہ میں ترمیم کے مطالبے کے لئے صف بستہ کیا جارہا ہو بلکہ مطالبات کرائے جارہے ہوں اور غیر اسلامی مشینری اس مطالبے کی اہمیت کا پرچار کر رہی ہو جس سے ہندوستانی سیکولر حکومت کی یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے کی پالیسی کی راہ ہموار ہو رہی ہو تو اب اگر متاع کے عنوان سے مطلّقہ کو زوجین کے حالات و ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک مناسب رقم یکمشت دلوادی جائے جس سے مطلّقہ عورتوں کی فوری دستگیری بھی ہوجائے اور دلجوئی بھی اور ان کے شوہروں کے خلاف ان کا غُصّہ بھی کم ہوجائے جو متاع کی مصلحت

قرار دی گئی ہے تو کیا اس کی شرعاً گنجائش ہے ؟۔ اس کو کیا کہنا مناسب ہوگا ـــــ مداخلت فی الدین ؟ ـ یا ـ اسلام ہی کے ایک فراموش جزء کو جاری و نافذ کرنا ؟ ـــــ مذکورہ بالا دونوں باتوں میں سے پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ یہ اپنی جگہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اپنے امام مجتہد کے قول و مذہب سے عدول وانحراف کے اسباب صرف چار ہی ہو سکتے ہیں ۱ ضعف دلیل ۲ ضرورت داعیہ ۳ تعامل النّاس ۴ اختلاف زمان ـــــ ظاہر ہے کہ کسی امام مجتہد کی دلیل کے ضعف کو سمجھنا یہ کسی امام مجتہد ہی کا کام ہے لہٰذا عہدِ حاضر کے کسی عالم پر ایسی ذمہ داری ڈالی ہی نہیں جا سکتی جو اس کی استطاعت سے باہر ہو ـــــ رہ گئی ضرورت تو مسئلہ زیر بحث میں کوئی ایسی ضرورت شدیدہ ملحقہ بھی نہیں جو مسلک امام سے عدول کا باعث ہو۔ یہیں پر یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ مفقود الخبر کے بارے میں خاص کر ایسی خواتین کو جن کے گناہِ عظیم میں مبتلا ہو جانے کا شدید اندیشہ ہو اور ان کی بے راہ روی اختیار کر لینے کا گمان غالب ہو مسلک امام مالک پر عمل کرنے کی رخصت دینا خود اپنے امام کے مسلک سے بالکلیہ انحراف ہرگز نہیں۔ ہمارے مفتی پر لازم ہے کہ وہ مسلک امام ہی پر فتویٰ دے۔ ہاں ۔ بعض خواتین کے مذکورہ بالا مخصوص حالات کے پیشِ نظر صرف انھیں کو مسلک امام مالک پر عمل کرنے کی رخصت دے سکتا ہے اس لئے کہ عند الضّرورت مسلک غیر کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا فقہاء میں معمول و مروّج ہے ـــــ مسئلہ زیر بحث کی نوعیت کچھ اور ہے یہاں بلا ضرورت شرعیہ بغیر تخصیص و استثناء کے عند الامام جو غیر واجب ہے اس کو واجب قرار دینے کی جسارت ہے جس میں بالکلیہ مسلک امام ہی سے انحراف ہے بلکہ عہدِ حاضر کے لئے اس کو سرے سے باطل قرار دے دینا ہے۔ مفقود الخبر کی صورت میں جو حقیقی ضرورت پیش آتی ہے اس پر اس فرضی ضرورت کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے جب یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلام نے محتاج اور بے سہارا عزیزوں کی کفالت کی ذمہ داری ان کے ان قریبی عزیزوں پر ڈالی ہے جو میراث کے مستحق ہیں کہ اگر خوشحالی میں ان کو اپنے عزیزوں سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے تو پریشان حالی میں ان کی کفالت کی ذمہ داری بھی انھیں قبول کرنی

لازمی ہے ـــــ پھر کون سی ضرورت آگئی جس کے لئے مسلک امام سے انحراف کیا جائے ـــــ رہ گیا تعامل النّاس یہ تو مسلک امام کے مطابق ہی ہے جس پر صدیاں گزر گئیں خود مسلک امام والے علماء کی اکثریت کا تعامل مسلک امام کے خلاف ہوتا تو ضرور قابل لحاظ ہوتا مگر یہاں ایسا کہاں ہے ؟ ـــ اس خاص مسئلے میں اختلاف زمان والی راہ سے بھی مسلک امام سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ زمانہ کا اختلاف اس خاص مسئلہ کی نوعیت پر اثر انداز نہیں ـــــ ویسے بھی جن دانشوروں نے یہ بات کہی ہے انھوں نے انحراف مسلک کے لئے ضرورت ہی کی راہ اپنائی ہے اور جب ثابت ہو گیا کہ ضرورت ہی نہیں تو پھر انحراف کی صورت بھی نہ رہی ـــــ اسلام کے قانون طلاق کو ظالمانہ سمجھنے والے غیر اسلامی اذہان کی زہر افشانیاں اور دفعہ ۱۲۵ کو (جو اجماعی طور پر مداخلت فی الدّین ہے) اپنے لئے سامانِ راحت سمجھنے والی اسلامیات سے بے خبر اور اسلامی ذہن و فکر سے دور مغربی چمک دمک سے متأثر ہو جانے والی نادان خواتین ـ یا ـــــ اسلامی آب و تاب مٹاتے کے لئے اسلام دشمن عناصر کی تیار کردہ آلۂ کار عورتوں کے شور و غل ـ نیز ـ اسلامی احکامات کے خلاف غیر اسلامی مشینری کی چیخ و پکار اور نام نہاد مسلمانوں کے غیر اسلامی مطالبات اور ہندوستان جیسی سیکولر حکومت کا کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو پامال کر کے دس پانچ ہزار سر پھروں کی حوصلہ افزائی کرنی اور عورتوں پر عدل و انصاف کے نام پر مردوں کو قانونی جبر و تشدّد کا نشانہ بنایا اور اربابِ اقتدار کی مسلمانوں کے ملّی تشخص و تفرّد کو بالکلیہ ختم کر دینے کی ریشہ دوانیاں ـ یہ وہ امور ہیں صبر و تحمل عزم و استقلال کے ساتھ جمہوری طریقے سے پر امن طور پر جن کا مقابلہ کرنا ہم تمام مسلمانوں کا ملّی اور دینی فریضہ ہے ـــ دین و شریعت کے مسلّمہ ضابطوں کا تحفّظ اور نادان مسلمانوں کو ان کی حکمتوں سے آگاہ کرنا ہماری ذمہ داری ہے ـــــ میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کی دستگیری اور دلجوئی نہ کی جائے میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ دستگیری و دلجوئی کی راہ وہی ہو جس سے دین و شریعت کے کسی مستحب کو واجب اور کسی غیر لازم کو لازم قرار دینا نہ پڑے جس طرح کسی حلال کو حرام ـ یا ـ حرام کو حلال کہنا مداخلت فی الدّین ہے اسی طرح

میں ہر مطلقہ کے لئے متعہ کا وجوب وعدمِ وجوب تو چونکہ یہ ائمہ میں اختلافی حیثیت اختیار کرچکا ہے لہٰذا اس میں ۔ نیز ــــ اس کی طرح دوسری صورتوں میں بلا ضرورت اپنے امام کے قول کو چھوڑ کر دوسرے کے قول کو اپنانا اگرچہ مداخلت فی الدین تو نہیں مگر اپنے مسلک و مذہب سے بیجا اور قابل مذمت انحراف ہے لہٰذا اُسے بھی اسلام کا جُزء فراموش کا نام دے کر اس کو نافذ و جاری کرنے کی کوشش ایک مذموم کوشش ہے جسے بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جاسکتا ـــــــ مسلمان عورتوں کی دستگیری یہ نہیں ہے کہ جبراً ان کو ان کے سابق شوہروں سے مال دِلا کر انھیں حرام خور بنا دیا جائے بلکہ سچّی دستگیری یہ ہے کہ زمینداری ایکٹ کے تحت ماں باپ کی وراثت سے اُنھیں جو محروم کیا گیا ہے اس محرومی سے انھیں نجات دلائی جائے ــــ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس پر شرعاً کفالت کی کوئی شرعی ذمّہ داری ہی نہ ہو اس کو جبراً ذمّہ دار بنایا جائے ــــ اس مقام پر یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے جیسا کہ اس کی طرف اِشارے بھی گزر چکے ہیں کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کے معاشرے میں جو کرب و اضطراب، جو طبقاتی کش مکش، جو بے چینی و بے اطمینانی اور ظلم و زیادتی نظر آرہی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اسلامی قانون میں کوئی نقص ہے یا کوئی کمی ہے۔ اسلامی ضابطہ حیات مکمّل ہے پاک ہے بے عیب ہے اس لئے کہ پاک و بے عیب کی طرف سے ہے ــــ بلکہ ــــ ان تمام اُلجھنوں کا واحد سبب یہ ہے کہ خود مسلمان اسلامی ہدایات سے عملاً دور ہوچکا ہے اسلام کو کماحقہٗ اپنی عملی زندگی میں داخل نہ کرنے کی یہ بھیانک سزا ہے کہ خود اسلام کا دامن آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتا ہوا نظر آرہا ہے ــــــــ

مسلمانوں کے معاشرے سے ہر طرح کی برائی دور کرنے کے لئے اسلام کے قوانین سے الجھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مسلمانوں کو اسلامی ہدایات کے مطابق زندہ رہنے پر مجبور کردینے کی ضرورت ہے ــــ مسلمانوں کا فریضہ صرف اسلام پر عمل کرنا ہے اُس کے قانون کو بدلنا نہیں ــــ اب اگر کسی کو اسلام ناقابل عمل نظر آئے ۔ یا ــــ وہ اُسے

امن اور رحمت کے بجائے ظلم و زیادتی کا دین دکھائی دے تو اس کے لئے کفر کے دروازے

طلاق کا سدِّباب کرکے حکومت بھیانک جرم ... رہی

اب آیئے بعض ان مفاسد کا جائزہ لیجئے قانون زیر بحث کی اساس پر جن کے روشن امکانات ہیں تاکہ قانون الٰہی کے مقابلے میں قانون اِنسانی کی قباحت و شناعت کا ادراک کیا جاسکے۔

۱۔ اس قانون کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طلاق کا بالکلیہ سدِّباب ہوجائے حالانکہ طلاق کے بالکلّیہ سدّباب کی کوشش غیر فطری بھی ہے اور تباہ کن بھی اِس لئے کہ ایسی صورت بھی ممکن ہے کہ مرد عنین ہو یا خصّی ہو یا مخنّث ہوجائے ۔ یا ــــ حبس دوام کا قیدی ہوجائے ۔ یا ــــ نان و نفقہ دینے کی بالکلیہ استطاعت کھو بیٹھے۔ ان صورتوں میں طلاق ہی ایک واحد ذریعہ ہے جو عورت کو زندگی کے کرب و اضطراب سے نجات دِلا سکتا ہے ــــ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو نان و نفقہ دینے کی استطاعت نہ رکھنے کے سبب بیوی کو آزاد کردینا چاہتا ہو آزاد کردینے کے بعد اس پر نان و نفقہ لازم قرار دینا کس قدر ظالمانہ سلوک ہوگا۔

۲۔ یہ قانون تمام طوائفوں میں اس تحریک کا موجب ہوسکتا ہے کہ وہ ایک پاکیزہ اور باوقار زندگی گزارنے کا ڈھونگ رچائیں اور کسی نہ کسی سے اپنا نکاح کرلیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد از خود حالات کو سنگین بنا دیں ــ یا ــ اپنی سابقہ بے حیائی اور بے شرمی والے کردار کا مظاہرہ کرنے لگیں جس سے شوہر کی عزّت و حرمت خطرے میں پڑ جائے اور انھیں طلاق دے دینے ہی میں اس کی آبرو کا تحفّظ ہوسکے یہاں تک کہ بغیر طلاق دیئے معاشرے میں اس کو عزّت کا کوئی مقام حاصل نہ ہوسکے اور اس وجہ سے وہ مجبوراً طلاق دیدے ــــ اور پھر ــــ علیحدگی اختیار کرلینے کے بعد وہ طوائفیں دوبارہ اپنی "کوٹھے والی زندگی"، کی طرف واپس ہوجائیں اور تاحیات دوسری شادی کا

تصور بھی نہ کریں اور خفیہ گھناؤنا کاروبار کے باوجود بھی اپنی بے روزگاری کا رونا روتی رہیں اور زندگی بھر اپنے سابق شوہر سے عدالت کا مقرر کردہ گزارہ حاصل کرتی رہیں اس طرح اپنی ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ نکال لیں اور بے چارہ شوہران کو پاکیزہ زندگی میں لانے کی سزا مرتے دم تک پاتا رہے۔

۳۔ اس قانون سے اُن عام خواتین میں جو شوہروں کی خدمت و اطاعت کے جذبات سے عاری ہیں اور جنھیں صرف نان و نفقہ کی ضرورت شوہروں کا پابند بنائے ہوئے ہے طلاق حاصل کرنے کا عام رجحان پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا جن خواتین کے دین و مذہب میں طلاق دینے کا حق صرف مردوں ہی کو ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے شوہر ہمیں کسی حال میں بھی طلاق نہ دیں گے ـــــ اور اب جب نان و نفقہ طلاق کے بعد بھی حاصل ہو سکتا ہے تو پھر اُن کے لئے شوہروں کا پابند رہنا ایک غیر دانشمندانہ عمل ہوگا ـــ لہٰذا ـــ وہ ایسے تباہ کن اور زندگی کو تنگ کر دینے والے حالات پیدا کریں گی کہ شوہر از خود طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اب اگر شوہر طلاق دیتا ہے تو نان و نفقہ کی ذمہ داری جبراً گلے لگتی ہے اور اگر طلاق نہیں دیتا تو زندگی کی تلخیوں کا شکار رہتا ہے اور اگر بالفرض اِن حالات میں شوہر طلاق کے سوا دوسری سختیوں پر اُتر آئے تو پھر عورت کے لئے زندگی کے لمحات اذیت ناک بن جاتے ہیں۔

۴۔ ہندوستان کی عام عورتوں کی یہ ذہنی کیفیت ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنے میکے والوں سے کچھ قبول کرنے میں تکلّف محسوس کرنے لگتی ہیں یہاں تک کہ ماں باپ کی جائداد میں ان کا جو حق وابستہ ہوتا ہے وہ بھی وہ اپنے بھائیوں سے لینا معیوب سمجھتی ہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اُسے معاف کر دیتی ہیں ـــ ایسی شادی شدہ عورتیں اگر برسرِ روزگار نہ ہوں تو ان کے شوہروں ہی پر ان کی آمدنی کا سارا انحصار رہتا ہے ـ لہٰذا ـ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی شوہر سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں ـ بلکہ ـ صبر و تحمّل اور ایثار و قربانی کا جذبۂ فراواں لئے ہوئے شوہر کے ساتھ ہی ایک باوقار زندگی گزارنا پسند کرتی ہیں اور بالفرض اگر کبھی

حالات ناسازگار ہو جائیں تو وہ حسن تدبیر سے اُسے سازگار بنانے میں لگی رہتی ہیں۔
ـــ لیکن ـــ یہ جبری قانون انھیں ایک تیسرا راستہ دکھا رہا ہے کہ معمولی سی بات کو بھی بڑھا کر پہاڑ بنا دیں اور شوہر سے علیحدگی اختیار کرنے کی جدوجہد میں لگ جائیں اور ایسی حرکت پر آمادہ ہو جائیں کہ شوہر از خود طلاق دیدے اور نان و نفقہ کی فکر نہ کریں اس لئے کہ علیحدگی سے پہلے جس کے سر اُن کی ذمہ داری تھی اُسے علیحدگی کے بعد بھی اُن کی ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی ـ نیز ـــ ان کی اس علیحدگی سے اُن کے میکے والے بھی زیرِ بار نہ ہوں گے۔

۵۔ مسلمان خواتین جن کی دینی حمیت اور مذہبی غیرت بفضلہٖ تعالیٰ مردہ نہیں ہوئی ہے اور وہ عدالتی علیحدگی کو طلاق شرعی نہیں سمجھتیں بلکہ طلاق کے مسئلے میں مکمّل اسلامی ہدایات کی پابند ہیں کہ جب تک خود شوہر طلاق نہ دے طلاق نہ ہوگی ـــ یہ قانون ان عورتوں کے دُکھ درد کا علاج نہیں ـــــ اس مقام پر یہ بھی خیال رہے کہ اس خیال کی عورتیں مسلم معاشرہ میں صرف دو چار نہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے ـ بلکہ ـ مسلم معاشرہ کی ہر عورت ایسی ہی ہے ـ اب اگر بالفرض کروڑوں مسلم خواتین میں چند عورت ایسی نکل آئیں جنھیں مغرب زدگی نے اندھا کر دیا ہو ـ یا ـ جو اپنے دین کی تعلیم سے بے بہرہ ہوں ـ یا ـ دنیاوی چند روزہ مفاد کے حصول کی متمنّی ہوں ـ یا ـ جو اندرونی طور پر اسلام چھوڑ چکی ہوں ـ یا ـ ابتداء سے رکھتی ہی نہ ہوں وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے غیر اسلامی فکر و عمل کا مظاہرہ کریں تو نہ سب کے لئے اُنھیں معیار بنایا جا سکتا ہے اور ان کو نظرِ اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے ـــــ اس قانون زیرِ بحث سے ایسی عورتوں کے دکھ درد کا علاج ہونا تو کجا اور دُکھ درد بڑھ جانے کا امکان قوی ہے ـــــ اس لئے کہ ـــ کبھی کبھی حالات کی سنگینی (جس کی میں وضاحت کر چکا ہوں) اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ شوہر لازمی طور پر طلاق دیدے ـ مگر ـ شوہر کے لئے یہ خوف طلاق دینے سے مانع ہے کہ طلاق دینے کے بعد بالکلیہ بے تعلّق و اجنبی کی صورت میں بھی مجھے ایک متعیّنہ رقم پیش کرنے کی ذمہ داری اٹھانی پڑے گی تو پھر کیوں نہ اس کو اپنا

پابند رکھ کر ہی اس کا بوجھ اٹھایا جائے ــــ اب اگر حالات کی سنگینی شوہر کی طرف سے ہے تو پھر عورت کو تڑپ تڑپ کر تا حیات زندگی گزارنی ہے اور اگر عورت کی طرف سے ہے تو شوہر کو گھُل گھُل کر جینا ہے۔ بعض شوہر ایسے ظالم ہوتے ہیں جو صرف اذیت پہنچانے کے لئے طلاق نہیں دیتے ایسے شوہروں کے لئے یہ قانون ایک بہانہ اور بھی دے رہا ہے۔

۷ـ دینی افکار و نظریات سے بے بہرہ غیر اسلامی ماحول میں دُنیاوی علوم حاصل کرنے والی شادی شدہ وہ خواتین جو ملازمت کر کے ایک حد تک معاشی و اقتصادی نقطۂ نظر سے اپنے شوہروں سے بے نیاز رہ سکتی ہیں جب وہ یہ سوچیں گی کہ علیحدگی کی صورت میں بھی ان کے سابق شوہروں پر اُن کی ذمہ داری بدستور رہے گی تو پھر وہ ملازمت کی مشقت قبول کرنے کی خواہش ہی کیوں کرنے لگیں ـ بلکہ ـ اس صورت میں وہ تو ملازمت سے آزاد رہنے ہی میں راحت محسوس کریں گی اور بالفرض اگر ان کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہو کہ شوہروں کی بالادستی اور حاکمیت قبول کرنے سے زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ تنہا الگ اپنی ایک دُنیا بسائی جائے جہاں اپنی مرضی کے مطابق عمل پر کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہو تو اس قانون سے ان کو بھی فائدہ پہنچے گا بلکہ ان کی سرکشی کو ایک قوت ملے گی اس لئے کہ علیحدگی حاصل کر لینے میں ان کو یہ اندیشہ بھی نہ ہوگا کہ اب شوہر کی آمدنی میں اُن کا کوئی حصہ نہیں رہ گیا اس لئے کہ شوہر کی محکوم رہنے کی صورت میں جو اُنھیں ملنا ضروری تھا وہ محکومیت سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی ملتا رہے گا۔ اور بے چارہ شوہر صرف اپنی سابقہ حاکمیت کی یاد سینے میں دبائے ہوئے کروٹیں بدلتا رہے گا ــــ ایسی عورتیں ایسا بھی کر سکتی ہیں کہ وہ اپنی دستکاری کا مظاہرہ کر کے خفیہ طور پر اپنی آمدنی کے دوسرے ذرائع بھی نکال لیں جس کا کسی کو علم نہ ہو سکے۔

۸ـ اُس صورت میں جب کہ مرد نے ازخود ظالمانہ طور پر طلاق دے دیا ہو اور عورت کا ذرہ برابر قصور نہ ہو ـ یا ـ خود عورت نے مرد کے ظلم و جور سے تنگ آ کر طلاق

لے لیا ہو اور اس طلاق لینے میں وہ حق بجانب ہو۔ اگر زوال نکاح کے بعد مرد پر عورت کے نفقہ کے نام سے کچھ واجب کیا گیا ہو تو یہ بھی باطل ہے جیسا کہ اوپر مفصل گفتگو ہو چکی ہے مگر اس باطل کا بطلان عوام بآسانی نہیں سمجھ پاتے بلکہ اس کو سمجھنے کے لئے کمال فراست اور گہری دینی بصیرت درکار ہوتی ہے ـ مگر ــــ وہ صورت جبکہ خود مرد بے قصور ہو اور حد درجہ مجبور ہونے کے بعد اس نے اپنی عورت کو طلاق دیا ہو ـ یا ــــ خود عورت نے بلا وجہ ازخود سنگینی حالات کی ڈرامہ سازی کر کے طلاق حاصل کر لی ہو اس کے باوجود زوال نکاح کے بعد مرد پر عورت کا نفقہ لازم کر دینا ایک ایسا ظلم عظیم ہے جس کی ظلمت و تاریکی ایک عام آدمی بھی محسوس کر سکتا ہے۔

۹ـ مرد و عورت کے درمیان بذریعہ نکاح جو ازدواجی تعلق اور زن و شو کا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے وہ محض اپنی نفسانی اور جنسی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے نہیں اور نہ نکاح کا یہ مقصد ہے کہ ایک مرد اور عورت کسی نہ کسی طرح دوسرے کے گلے پڑ جائیں ـ یا یہ کہ ـ عورت کو مرد کی شہوانی خواہشات کی تکمیل کا آلۂ کار بنا دیا جائے ـ یا یہ کہ ـ عورت کے لئے روٹی، کپڑا اور مکان کا انتظام کر دیا جائے ــــ اگر نکاح کا مقصد یہی سب کچھ ہوتا تو پھر ان سارے امور کے لئے نکاح متعارف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ طوائفوں کو تو بغیر نکاح کے یہ ساری باتیں حاصل ہیں ـ بلکہ ــ نکاح متعارف سے ہٹ کر بھی بعض مذاہب میں ایسی چیزیں رائج ہیں جس میں عورت کے لئے روٹی کپڑا اور مکان کا انتظام بھی ہو جاتا ہے اور دونوں کی بدمستی کا نشہ بھی اُتر جاتا ہے ــــ معلوم ہوا کہ ــــ نکاح متعارف کا مقصد اتنا گھٹیا نہیں ہو سکتا جس کو دوسرے قبیح و شنیع طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکے اور جس کے حصول کے لئے نکاح کی بالکل ضرورت ہی نہ ہو۔ المختصر ــ عقدِ نکاح کو کوئی کاروباری عمل ـ یا ـ تجارتی معاہدہ سمجھنا ہرگز صحیح نہیں شریعت اسلامیہ میں نکاح ایک دینی اور مذہبی عمل اور ایک گہرا تمدنی اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مرد و عورت میں الفت و یگانگت اور میاں بیوی میں باہمی مناسبت کا پاکیزہ رشتہ ہے جس کا مقصودِ اصلی یہ ہے کہ مرد و عورت کے میل ملاپ سے ایک کامل اور

خوشگوار زندگی وجود میں آئے اور نسل انسانی کا سلسلہ بھی حدود الٰہی کی نگرانی کے درمیان بڑھتا اور پھولتا پھلتا رہے۔ اور مرد و عورت کے درمیان باہمی محبّت و اخلاص اور دوطرفہ جذب و کشش کا وہ عالم ہو کہ وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد و غمخوار اور رنج و راحت میں شریک رہیں اور زندگی کے منجدھار میں اپنی کشتی ایک ساتھ کھینچتے رہیں۔ یہاں تک کہ عورتیں اپنے مردوں کے لئے راحت قلبی اور تسکین رُوحانی کا سرمایہ اور دِلی سکون کا باعث ہو جائیں ـــ نیز ـــ عورتوں کی عفت و عصمت کے تحفّظ کے لئے ایک مضبوط قلعے کی تعمیر ہو جائے جس میں وہ عزّت و عافیت کے ساتھ سانس لیتی رہیں ـــ ذہن نشین رہے کہ ـــ عورت کی فہم و فراست، علم و ہُنر، دولت و ثروت حتّٰی کہ ریاست و حکومت بھی اس کی عصمت و عفّت کی محافظ نہیں ہو سکتی اس کا تحفظ پاکیزہ ازدواجی تعلّقات سے ہو سکتا ہے بیویوں پر شوہروں کی قوّامیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ شوہر بیوی کی عفّت و عصمت کے جوہر لطیف کا محافظ ہے ـــ اس مختصر سی تمہید پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ حکومت وقت کے منظور شدہ قانون زیر بحث نے نکاح کے تقدّس کو ایسا مجروح کیا ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی ـــ اس قانون کے مضمرات پر جو شخص جس قدر غور کرے گا وہ اسی قدر نکاح جیسے مقدّس عمل کو بلائے بے داماں سمجھنے پر مجبور ہو جائے گا اور بیٹھے بٹھائے اپنے کو ہمیشہ کے لئے مبتلائے آفات کر لینے سے بہتر یہی سمجھے گا کہ اپنی فطری تسکین کے لئے کوئی دوسری راہ تلاش کرے اور ظاہر ہے کہ جیسے جیسے یہ رجحان بڑھتا جائے گا انسانیت بہیمیت کی طرف قدم بڑھاتی جائے گی جس کے نتیجے میں ایک ایسے فساد فی الارض کا ظہور ہو گا جس کی تباہ کاریوں سے بحر و بر اپنے کو بچا نہیں سکتے ـــ مادیت زدہ افراد اتنا بھی نہ سوچ سکے کہ اگر عورت کے لئے روٹی کپڑا اور مکان کی ضرورت ہی سب سے بڑی ضرورت ہے تو پھر شہنشاہوں، بادشاہوں، راجاؤں، مہاراجاؤں، امیروں، رئیسوں، ٹاٹاؤں، برلاؤں اور ڈالمیاؤں کی بہن بیٹیاں اپنے باپ دادا کے ایوانوں اور محلوں کو چھوڑ کر دوسروں کے گھروں میں کیوں گئیں اُن کے

لئے روٹی کپڑا اور مکان کا کون سا مسئلہ درپیش تھا۔

۱۰ـ زوجین اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے چار حال سے خالی نہیں۔

اوّل : دونوں بے حد شریف النّفس اور دینی اقدار کے حامل ہوں۔

دوم : دونوں نہایت زبوں کردار، بدمزاج اور ناشائستہ خصلت ہوں۔

سوم : شوہر ظالم و بدسرشت ہو لیکن بیوی نیک سیرت اور اعلیٰ کردار ہو۔

چہارم : شوہر نہایت شریف، سلیم الطّبع اور خوش اطوار ہو لیکن بیوی نہایت درشت مزاج، بدزبان اور نافرمان ہو۔

پہلی صورت میں ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے اختراع کی ضرورت نہیں دوسری صورت میں یہ دفعہ میاں بیوی دونوں کے لئے عذابِ جان ہے اس لئے کہ جب دونوں زبوں کردار ہیں تو دونوں کی ازدواجی زندگی کی تلخی محتاج بیان نہیں اب ان میں جو قوی ہو گا وہ کمزور پر مظالم کرتا رہے گا۔ اب اگر ان دونوں کے درمیان بذریعہ طلاق خلاصی کی راہ سوچی بھی گئی تو دفعہ ۱۲۵ اس کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے گی ـــ المختصر ـــ دفعہ ۱۲۵ ایسوں کی ازدواجی زندگی کو خوشگوار ماحول میں لانے کے لئے زبردست رُکاوٹ ہے۔ تیسری صورت کا حال بھی دوسری صورت ہی جیسا ہے صرف یہ فرق ہے کہ دوسری صورت میں ایک بدمزاج عورت دفعہ ۱۲۵ کے جبری قانون کے سبب اپنے شوہر کے ظالمانہ کردار کا شکار تھی لیکن اس صورت میں ایک نیک سیرت خاتون ظلم و جبر کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ رہ گئی چوتھی صورت تو اس میں ایک شریف النّفس مرد بیوی کی بدکلامی، بدمزاجی اور زیادتی و سرکشی کو برداشت کرنے پر مجبور ہو گا اس سے نجات حاصل کرنے کی اس کے پاس کوئی شکل نہیں اس لئے کہ طلاق کی راہ میں دفعہ ۱۲۵ حائل ہے ـــ اب اس کے لئے یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی شرافت کو بالائے طاق رکھ لے اور جیسے کو تیسا والے ضابطے پر عمل کرنے لگے ظاہر ہے کہ یہ عمل بیوی کے لئے کس قدر اذیت ناک ہو گا ـــ المختصر ـــ دفعہ ۱۲۵ کے بطن سے پیدا ہونے والے مفاسد اس قدر اہم اور واضح ہیں کہ ان سے صرف نظر کرنا ایک حقیقت

ثابت ہے بے جا چشم پوشی ہے افسوس ہے کہ ارباب اقتدار اتنا بھی غور نہ کر سکے جو دفعہ تمام خواتین کی صلاح و فلاح کے نام پر وضع کی گئی ہے وہ مسلم خواتین کے لئے کس قدر تباہ کن ہے۔

۱۱۔ سماجی نقطۂ نظر سے بھی یہ فیصلہ عورتوں پر اثر انداز ہوگا اس کے نتیجے میں عورتوں کو جلانے کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں دوسرے مذاہب میں کسی ناپسندیدہ عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہی واحد ذریعہ ہے اگر ان میں دوسرے راستے کھلے ہوئے تو اس قسم کے واقعات نہ ہوتے لیکن اس فیصلے کے بعد جب شوہر کسی ناپسندیدہ بیوی سے چھٹکارا پانا چاہے گا اور اس میں اس کو دشواری ہوگی تو اسٹو پھٹنے اور نائلان کی جھوٹی کہانیاں گڑھی جائیں گی۔ (قومی آواز لکھنؤ ۲۶ اپریل ۱۹۸۵ء)

۱۲۔ تصور میں لائیے کہ کوئی شخص ۳۵ سال کی کسی عورت کو طلاق دیتا ہے تو اگر اس کو تیس چالیس برس تک نان و نفقہ دینا پڑے گا تو اس کے کرب کا اندازہ لگائیے یہ بھی سوچئے کہ اگر وہ عورت بدکاری کی طرف مائل ہو جاتی ہے تب بھی مرد اس کو نان و نفقہ ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔ (قومی آواز لکھنؤ ۲۶ اپریل ۱۹۸۵ء)

۱۳۔ وہ عورتیں جو طلاق کے بعد بھی دوسری شادی کر لینے کا سن و سال رکھتی ہیں دفعہ ۱۲۵ کے تحت سابق شوہر سے نان و نفقہ ملنے کی صورت میں دوسری شادی کا خیال بھی نہ کریں اور اس طرح دوسری شادی کر کے باعزت زندگی گزارنے کا عام رجحان رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا جائے گا اور پھر یہی ان کی فطرت ثانیہ بن جائے گی اور پھر یہ بھی عجب نہیں کہ آگے چل کر دوسری شادی کو عیب سمجھا جانے لگے۔ اس سے اگر ایک طرف یہ ہوگا کہ اسلام نے دوسری شادی کی جو ترغیب و تحریص دلائی ہے انسانی معاشرہ اس کے انوار و برکات سے بالکل محروم ہو جائے گا۔ تو۔ دوسری طرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اندرونی خواہشات و جذبات کا بے پناہ دباؤ بے شرم و بے حیا سوسائٹی میں ایسا گم کر دے کہ اس کے پورے وجود میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہی نہ رہ جائے۔

۱۴۔ مذکورہ بالا تمام خرابیاں تو اس صورت میں تھیں جب مرد کی طرف سے طلاق کا وقوع ہو لیکن دفعہ ۱۲۵ نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس دفعہ کی عطا کردہ

رعایت کی مستحق وہ خاتون بھی ہے جس نے خود سے طلاق حاصل کر لی ہو اور دفعہ ۱۲۷ کی وضاحت کے مطابق طلاق حاصل کر لینے کے بعد شوہر پر اپنے جملہ حقوق سے از خود رضاکارانہ طور پر دستبردار نہ ہو گئی ہو ـــــ عورت کو از خود طلاق لینے کے بعد بھی دفعہ ۱۲۵ کی رعایت کی مستحق قرار دینے میں جہاں وقوع طلاق کے بعد والی مذکورہ بالا ساری خرابیاں لازم آتی ہیں وہیں عورتوں کے لئے سرکشی و تمرد کی دوسری راہیں بھی کشادہ ہو جاتی ہیں۔ اب تو طوائفیں بھی یہ کر سکتی ہیں کہ اوّلاً وہ پاکیزہ زندگی کے حصول کا نام لے کر کسی سے اپنا نکاح کر لیں اور پھر خود کچھ دنوں کے بعد اپنے شوہروں کے فرضی مظالم کی ایک کہانی تیار کر لیں اور کورٹ کے ذریعہ نام نہاد طلاق (علیحدگی) بھی حاصل کر لیں اور پھر اپنے سابقہ ماحول میں پلٹ جائیں اور زندگی بھر اپنے سابقہ شوہروں سے عدالت کا مقرر کردہ گزارہ وصول کرتی رہیں اور بے چارہ شوہر ان سے نکاح کرنے کی حماقت پر زندگی بھر روتا رہے۔ یوں ہی ـــ جن خواتین کے دین و مذہب میں طلاق دینے کا حق صرف مردوں ہی کو ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے شوہر ہمیں کسی حال میں بھی طلاق نہ دیں گے۔ نیز۔ وہ شوہروں کی خدمت و اطاعت کے جذبات سے عاری بھی ہوں تو پھر وہ اپنے دین و مذہب کے اصولوں کو توڑنے پر مجبور ہو جائیں گی اور موجودہ عدالت کا سہارا لے کر جدائی حاصل کر لیں گی ان کو اندیشہ ہی کیا ہے اس لئے کہ سابق شوہر کو گزارے کے لئے انھیں کچھ نہ کچھ تو دینا ہی ہے اس صورت میں ایک مسلم خاتون کو مذہب کشی کے دو دو مرحلوں سے گزرنا پڑے گا ایک تو موجودہ عدالت کی علیحدگی کو طلاق سمجھنا اور دوسرا ایک اجنبی ہو جانے والے فرد سے جبراً نفقہ وصول کرنا اور اس طرح رزق حرام سے اپنی پرورش کرنی۔ یوں ہی ـــ جن خواتین کا ذکر ۴ میں کیا جا چکا ہے اگر شوہر سے طلاق لینے میں انھیں کچھ دشواری محسوس ہوئی تو وہ بھی از خود بذریعہ عدالت شوہر سے علیحدگی اختیار کر لیں گی اور خود کو مذہب کشی کے دونوں مرحلوں کے حوالے کر دیں گی۔

۱۵۔ یہ صحیح ہے کہ غیر اسلامی عدالتوں کے ذریعہ حاصل کردہ علیحدگی اسلامی نقطۂ نظر سے

شرعی طلاق نہیں اس طرح بیوی اپنے اصل شوہر کے نکاح سے باہر نہیں ہوتی اب اگر وہ اسی علیحدگی کو بنیاد بنا کر کسی دوسرے شخص سے شادی کر لے تو اس شخص سے اس کے جملہ تعلقات زن وشو کھلی ہوئی حرام کاری ہوں گے اس نتیجے میں جو بچے پیدا ہوں گے وہ قطعی طور پر ولد الزنا ہوں گے اور اس عورت کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہ ہوگی ـــ بایں ہمہ ـــ غیر اسلامی کورٹ سے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کی صورت کی آسانی اور اس پر پھر دفعہ ۱۲۵ کی رعایت یہ دونوں چیزیں غیر اسلامی ذہن رکھنے والی ـ یا ـ اسلام سے ناواقف ـ یا ـ تہذیب نو کی ساختہ وپرداختہ بے راہ رو خاتون کے لئے طلاق حاصل کرنے میں مضبوط محرک بن سکتی ہیں ـــ اور جب طلاق حاصل کرنا عورتوں کے لئے گویا ان کے اختیار کی چیز ہوگیا تو پھر دفعہ ۱۲۵ کا اختراع انسداد طلاق کے جس مقصد کے لئے کیا گیا تھا وہ بالکل حاصل نہ ہوگا اور طلاق کی غیر معمولی کثرت ہو جائے گی جیسا کہ مغربی ممالک میں آج ایسا ہو رہا ہے تو دفعہ ۱۲۵ نے بارش سے بچانا چاہا تھا مگر پرنالے کے نیچے لا کے کھڑا کر دیا۔

۱۶ خدانخواستہ اگر عورتوں میں اپنے شوہروں سے علیحدگی حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا اور پھر وہ رجحان عام ہوگیا تو موجودہ عدالتوں کی علیحدگی کو طلاق شرعی سمجھنے کی خرابی کے سوا ایک دوسری عظیم خرابی بھی ظہور پذیر ہو جائے گی وہ یہ کہ عورتیں اپنے شوہروں کے نظر واعتبار واعتماد سے گر جائیں گی کوئی شوہر ان کو اپنا ہمراز اور اپنی ملکیت کی محافظ وامین نہ بنائے گا اور اس کے ساتھ ہمیشہ غیریت کا سلوک رکھے گا اس لئے کہ اس کو ہر وقت خوف رہے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خفیہ طور پر ہماری بیوی ہمارے ہی مال ودولت سے اپنی ایک دوسری دنیا آباد کرے اور اچانک سنگین حالات کا ڈرامہ کھڑا کر کے کورٹ کے ذریعہ علیحدگی اختیار کرے پھر تو ہم کہیں کے نہ رہ جائیں گے۔ بولئے ان حالات میں بیوی کی حیثیت تنخواہ دار ملازمہ جیسی ہوگئی کہ نہیں؟ شوہر اس پر اسی وقت اعتماد کر سکتا ہے جب اُسے یقین ہو کہ یہ اس وقت تک میرے

عقد سے نکل نہیں سکتی جب تک میں خود نہ چاہوں۔

۱۷ سی۔آر۔پی۔سی کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت بیوی کی جو تشریح کی گئی ہے وہ بھی عجیب وغریب ہے کہ ـ" بیوی شامل ہے اس عورت کو جسے اس کے شوہر نے طلاق دیدیا ہو ـ یا جس نے اپنے شوہر سے خود طلاق حاصل کیا ہو اور اس کا عقدِ ثانی نہ ہوا ہو ـ" اس سے زیادہ آسان تو یہ تھا کہ کہہ دیا جاتا کہ "بیوی وہ ہے جو سب کچھ ہو مگر بیوی نہ ہو"

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ مطلقہ عورت کو یا تو طلاق رجعی دی گئی ہوگی ـ یا ـ طلاق بائن ـ یا ـ طلاق مغلظ ـ طلاق رجعی سے بیوی فوراً نکاح سے نہیں نکل جاتی لہٰذا گنجائش رہتی ہے کہ عدت کے بلا نکاح ہی رجعت کر لی جائے ـ مگر ـ طلاق بائن اور طلاق مغلظ میں فوراً ہی وہ نکاح سے باہر ہو جاتی ہے مؤخر الذکر ان دو طلاقوں میں فرق یہ ہے کہ طلاق بائن کے ذریعہ نکاح سے باہر ہونے والی عورت کو صرف نکاح کر کے دوبارہ اپنی زوجیت میں واپس لایا جا سکتا ہے مگر طلاق مغلظ کے بعد عورت نکاح سے ایسا نکلتی ہے کہ اب نکاح کے ذریعہ بھی سابق شوہر اُسے اپنی زوجیت میں نہیں لا سکتا جب تک کہ عورت حلالہ کے معروف ومتعارف مرحلے کو طے نہ کر لے ـــ اس مختصر سی وضاحت کے بعد آیئے اور فرض کیجئے کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ کو طلاق بائن دی اور ہندہ اس کے نکاح سے نکل گئی۔ اب شریعت یہ کہتی ہے کہ ہندہ زید کے لئے بالکل اجنبیہ ہوگئی اب دونوں کی ایک دوسرے سے قربت قطعی حرام ہے زید کے لئے ہندہ اب بالکل اسی طرح ہوگئی ہے جس طرح زید کے سوا اپنے دوسرے نامحرموں کے لئے ہے لہٰذا ہندہ سے اگر زید کے سوا کوئی شادی کرنا چاہے تو اسلامی ہدایات کی روشنی میں کر سکتا ہے ـــ مگر ـ بیوی کی مذکورہ بالا آئین کی وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے زید کے لئے ہندہ کے قریب ہونا، اُسے چھونا، بلکہ اُسے دیکھنا، اُسے اپنے پاس رکھنا یہ سب کچھ حرام ہونے کے باوجود ہندہ زید ہی کی بیوی ہے ـ یعنی ـ اگرچہ وہ غیر منکوحہ ہوگئی ہے مگر ہے بیوی ہی ـ تو جب بیوی ہونے کے لئے منکوحہ رہنے کی ضرورت نہیں تو پھر بخل سے کام کیوں لیا گیا کیوں نہیں کہہ دیا گیا کہ

مطلقہ عورت کا جب تک عقد ثانی نہ ہو وہ ان تمام لوگوں کی بیوی ہے جس سے اس کا نکاح ہو سکے۔ اس طرح سے ہر فرد سے اس کا نان ونفقہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اُس کی اقتصادی حالت کو کافی مضبوط کیا جا سکتا ہے ـــــ اسلام بیزار آخرت فراموش خواتین کے لئے حرج ہی کیا ہے کہ وہ اپنی مالیات کو مضبوط کرنے کے لئے بغیر کسی عقد و ربط کے کروڑوں نا محرموں کی بیوی کہلانا منظور کر لیں ـ اس لئے کہ ـ جب کسی ایک نا محرم غیر شوہر کی بیوی کہلانے میں کوئی قانونی اخلاقی برائی نہیں ہے تو پھر کروڑوں نا محرم شوہروں کی بیوی کہلانے میں کون سی قانونی و اخلاقی بُرائی آجاتی ہے ؟ ـــــ اس سے زیادہ سنگین صورت اس وقت ہوگی جب کہ زید نے ہندہ کو طلاق مغلّظہ دے دی ہو ـــ اس صورت میں بھی آئین کی وضاحت ہندہ کو زید ہی کی بیوی قرار دیتی ہے ـــ حالانکہ ـــ اس صورت میں ہندہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ زید کی زوجیت میں بذریعہ نکاح بھی واپس نہیں آسکتی ـ بلکہ ـ اُسے صرف یہ اختیار رہے گا کہ عدّت گزارنے کے بعد زید کے سوا اپنے کروڑوں نا محرموں میں سے جس ایک فرد سے چاہے نکاح کر کے اس کی زوجہ بن جائے لیکن زید کی زوجیت میں نہ تو اپنی مرضی سے آسکتی ہے اور نہ زید کی مرضی سے اور نہ ہی دونوں کی مرضی سے ـ کتنے حیرت کی بات ہے کہ ہندہ جس سے نکاح تک نہ کر سکے اس کی بیوی کہلائے اور جس سے بلا تکلّف نکاح کر سکے اُس کی بیوی نہ سمجھی جائے ـــ جو آئین اس حال میں بھی ہندہ کو زید کی بیوی قرار دیتا ہے اس کے لئے تو زیادہ قرین قیاس یہ تھا کہ وہ ہندہ کو زید کے سوا ہر نا محرم کی بیوی قرار دے دیتا۔

مسلمانوں کی عدالتِ الٰہیہ ـ کتاب و سنت ہے۔

اس ہندوستان کی سرزمین پر کم و بیش پندرہ کروڑ مسلمان بسے ہوئے ہیں یہ ملک جن کا وطن ہے اور جن کے آباء واجداد نے اس وطن عزیز کے لئے بے پناہ قربانیاں پیش کی ہیں ـــ نیز ـــ جو اپنے دوسرے برادران وطن کے ساتھ انسانی بھائی چارگی کا بہترین مظاہرہ کرتے رہے ہیں اور جنھوں نے ہمیشہ اپنے نبی کے ان ارشادات کو پیش نظر رکھا ہے ـ" الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ "ـ

مخلوق سب کی سب خدا کا کنبہ ہے پس وہ شخص اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب بندہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی کرتا ہے ـ کُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا ـ اے بندگانِ خدا بھائی بھائی بن جاؤ ـــــ مگر ـــــ یہ وقت کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ ایسی رواداراور امن و شانتی اور صلح و سلامتی کی دلدادہ قوم بھی شر پسند عناصر کے جارحانہ اقدامات کا مسلسل نشانہ بنی ہوئی ہے ـــ معاشی و اقتصادی حیثیت سے اس کے دائرے کو جتنا تنگ کیا جا سکا کیا گیا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے یوں ہی سرکاری ملازمتوں میں اس کو دال کے نمک کی بھی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ اُسے مفلوکُ الحال بنانے کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا گیا ـــ اگر ـــ مسلمانوں کے مستحکم عقائد و نظریات ہر مشکل گھڑی میں ان کو سہارا نہ دیتے تو یہ کب کے معدوم ہو چکے ہوتے ـ مگر ـ یہ خوب جانتے ہیں کہ موت و حیات عزّت و ذلّت، تنگدستی و کشادہ حالی صحت و بیماری، آرام و تکلیف اور تمام مخلوق تک رزق رسانی وغیرہ امور ربّ کریم نے کسی کے قبضہ و اختیار میں دیا ہی نہیں ـ یہ سب اسی کی طرف سے ہے اور اس میں اس کی بے شمار حکمتیں ہیں ان تمام امور میں اگر کہیں کوئی مخلوق دخیل نظر آئے تو اس کی حیثیت صرف ایک سبب کی ہے مُسبب الاسباب خالق کائنات رب العالمین رزاق مخلوقات ہی ہے ـــ اور پھر ـــ مؤمنین پر جو تکلیف پہونچتی ہے ان پر صبر کرنے سے رب کریم کی طرف سے جن انعامات و اکرامات کے وعدے ہیں وہ الگ سے ہر مومن کے لئے بہشت خیال ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ہر مومن کے لئے اس پر نازل ہونے والی چھوٹی سی چھوٹی تکلیف کا دافع سیئیات اور بصورت دیگر رافع درجات ہونا ایک منصوص حقیقت ہے جو دُنیا کی بڑی سی بڑی تلخی کو بخوشی گوارا کر لینے کا جذبہ عطا فرماتی ہے ـ مسلمان اس خوش نصیب قوم کا نام ہے جس کا ماضی نہایت ہی روشن اور شاندار ہے اس کے لئے شاہراہ حیات کے ہر پیچ و خم ہر گلی کوچے، ہر نشیب و فراز اور آرام و تکلیف کی ہر منزل میں ایسے مکمّل نمونوں کے مینارہ ہائے نور نصب ہیں جن کے کردار کی روشنی میں یہ قوم مصائب کی کلائیاں موڑتی ہوئی، ظلم و ستم کے پہاڑوں کو پاش پاش کرتی ہوئی،

شدید ترین عداوتوں کی موجوں سے کھیلتی ہوئی، بے کسی اور بے بسی کے صحراؤں کو روندتی ہوئی اور عزائم غروری کے شعلوں کو جنّت بداماں بناتی ہوئی آگے قدم بڑھاتی ہی جائے گی مسلمانوں کو ناقابل تسخیر بنا دینے والی چیز اس کا ایمان وایقان ہے اور ہر مشکل سے مشکل مرحلے میں قدم آگے بڑھا دینے کا حوصلہ بخشنے والی اس کے ماضی کی روشن تاریخ ہے۔ لہٰذا ــــ قوم مسلم جب تک اپنے ایمان وعمل کی اندرونی قوّت کی حفاظت کرتی رہے گی اور اپنے اسلاف کی تاریخ کو ذہن سے محو نہ کرے گی اس وقت تک اس کے تاریخی کردار کو کیسے فنا کیا جاسکتا ہے؟ ــــ آج مسلمانوں کے مسلمہ اصول کے خلاف قانون سازی وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھی جارہی ہے اور کچھ مسلم نما منافق اس طرزِ عمل کی تائید کر رہے ہیں۔ کیا ــ ان کو خبر نہیں کہ چودہ صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور اس درمیان میں اسلام کو بڑی سی بڑی جابر وقاہر حکومتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے اصولوں کو مٹا دینا تو کیا اس کے دامن کو داغدار بھی نہ کیا جاسکا۔ اس کا راز یہ ہے کہ اسلام کی حفاظت خود رب کریم نے اپنے ذمّہ کرم میں رکھی ہے۔ اِنّا نحن نزلنا الذکر و انّا لہ لحٰفظون ــــ ہمیں قرآن کو نازل فرمانے والے ہیں اور ہمیں اس کی حفاظت فرمانے والے۔ اب اگر اربابِ اقتدار کو یہی ضد ہے کہ وہ اسلامی اصول کے خلاف قانون بنا کر رہیں گے تو پھر مسلمان کی طرف سے بھی وہ سُن لیں کہ اب ہم اپنے ان تمام معاملات کو حل کرانے کے لئے اس عدالت میں ہرگز نہ جائیں گے جو عدالت ہماری شریعت اسلامیہ کے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور ہے ــــ مسلمان محکم اصولوں اور لازوال ضابطوں کی جس کائنات میں بستے ہیں اس کائنات میں بھی ایک عدالت ہے اور صحیح معنوں میں عدالت وہی ہے جہاں کا ہر فیصلہ عدل وانصاف کی کوثر میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔ رہ گئیں عہد حاضر کی عدالتیں ان کو محض عرفاً عدالت کہا جاتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بے شمار فیصلوں میں سب کچھ تو ہوتا ہے مگر عدالت نہیں ہوتی بلکہ عدل وانصاف کا قتل عام ہوتا ہے اور وکلاء کی ذہانت وذکاوت کی سحر کاریوں کے مظاہرے ہوتے ہیں ــــ ان حالات میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ "اپنے بیشتر فیصلوں کی روشنی میں" عدالت نام ہے ایک ایسی بے انصافی کا

جسے بے انصافی نہیں کہا جاسکتا ــ جس طرح ــ موجودہ دور کی سیاست نام ہے ایک ایسی رذالت کا جسے رذالت نہیں کہتے ــــ ابھی ابھی میں نے مسلمانوں کی کائنات کی جس عدالت کا ذکر کیا ہے اُس عدالت کا سایۂ کرم ہر وقت مسلمانوں کے سروں پر رہتا ہے خواہ مسلمان کسی ملک میں بستے ہوں کسی بھی حکومت کے ماتحت ہوں۔ اس عدالت کے قیام اور اس کے فیصلوں کے نفاذ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ حکومت اسلامی ہو۔ اس عدالت الٰہیہ کا نام ہے کتاب وسنّت ــ چنانچہ تمام دنیا کے ایمان والوں سے صاف لفظوں میں کہا جارہا ہے کہ تم کہیں بھی رہو، کسی بھی ملک میں بسو اور کسی بھی حکومت کے ماتحت رہو خواہ وہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی ــــ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللّٰہ والرّسول ۔ پس اگر تم میں آپس میں کسی بات میں تنازع پیدا ہو جائے تو فیصلہ حاصل کرنے کے لئے اللہ ورسول کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ اور اللہ کی کتاب اور رسول کی سُنّت سے اپنا فیصلہ حاصل کرو۔ تمہارے لئے صرف کتاب وسنّت کی ہدایات کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ ہی صحیح فیصلہ ہے جو تمہارے لئے واجب الایمان اور لازم العمل ہے۔ یہاں تک اگر کسی اسلامی دار القضاء سے کتاب وسُنّت کی ہدایات کے خلاف فیصلے کئے جائیں تو اُسے بھی رد کر دینا واجب ہے اس لئے کہ لاطاعۃ فِی معصیۃِ اللّٰہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی بھی اطاعت نہیں کی جاسکتی ــــ اسی لئے امام احمد رضا نے مشورہ دیا ہے کہ "جن کاموں میں حکومت دخیل ہے ان کو اپنے گھر میں خدا ورسول کے احکام کی روشنی میں طے کرلیں" (ماہنامہ اعلیٰ حضرت بریلی شریف ص۱۰ مئی ۱۹۸۵ء) ــــ کتاب وسنّت کی عدالت ایک ایسی عدالت ہے جس سے ہم گھر بیٹھے ہر ماحول میں اللہ ورسول کی رضا کے مطابق فیصلے حاصل کرسکتے ہیں اور دنیاوی عدالتوں کے تباہ کن اخراجات سے اپنے کو بچا سکتے ہیں ــــ اب جسے اللہ ورسول کا فیصلہ پسند نہ ہو ــ یا ــ جس کے دل میں اللہ ورسول کے فیصلے سے کھٹک محسوس ہوتی ہو تو وہ اس آئینۂ حق نما میں اپنی اصلی صورت دیکھ سکتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے ــ فلَا وربّکَ لایُؤمنونَ حَتّٰی یُحکّمُوکَ فیما شجرَ بینھُم ثُمّ لایَجِدُوا فِی انفُسِھِم حرجاً ممّا قضیت ویُسلّموا تسلیماً ــ

اے محبوب قسم ہے آپ کے رب کی یہ ایمان والے ہو ہی نہیں سکتے یہاں تک کہ اپنے مشاجرات اور نزاعی معاملات میں آپ کو اپنا حکم نہ قرار دے لیں اور آپ کے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی کھٹک بھی محسوس نہ کریں بلکہ آپ کے فیصلے کو تسلیم کرلیں جیسا کہ تسلیم کرنے کا حق ہے ۔ اب اگر اپنے نزاعی معاملات میں یہ آپ سے فیصلے کے طالب نہ ہوں ۔یا۔ آپ کے فیصلے کو سُنیں اور پھر اس کو قبول کرنے میں تأمل کریں اور کماحقہ تسلیم نہ کریں ۔ تو پھر اے محبوب ایسی صورت میں صرف اپنے کو مسلمان کہہ دینے سے یہ ہرگز مسلمان نہیں ہو سکتے ۔ (امنت باللّٰہ باسمائہٖ وَصفاتہٖ وقبلت جمیع احکامہٖ ۔ ایمان لایا میں اللہ پر اس کے تمام اسماء و صفات کے ساتھ اور اس کے تمام احکام کو دِل سے قبول کرلیا ۔ کہہ کر ۔ مسلمان ہونے والا اگر جان بوجھ کر کتاب و سنّت کے فیصلوں کو کماحقہ تسلیم نہ کرے تو اس کو اپنے کو مسلمان سمجھنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ ۔۔۔ اب اگر خدا نخواستہ کوئی اپنے کو مسلمان والا مرد ۔یا ۔۔۔ کوئی اپنے کو مسلمان کہنے والی عورت کتاب و سُنّت کے کسی فیصلے سے راضی نہ ہو اور وہ غیر اسلامی عدالت کا دروازہ اس لئے کھٹکھٹائے کہ اسے اپنے کسی خاص نزاعی معاملے میں غیر اسلامی ہی فیصلہ چاہئے کیونکہ اس معاملے میں اسلامی فیصلہ اُسے پسند نہیں ۔۔۔۔۔ تو میں ایسے تمام لوگوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے کو مسلمان کہہ کر نہ تو دوسرے سچّے مسلمانوں کو فریب دیں اور نہ خود دھوکہ اٹھائیں ۔ بلکہ ۔۔۔ اپنے لئے کوئی ایک ایسا مناسب نام تجویز کرلیں جس سے ان کا ظاہر ان کے باطن کے بالکل مطابق ہو جائے ۔

قوم کے مفکروں دانشوروں شاعروں ادیبوں خطیبوں صحافیوں سے شیخ الاسلام کی گزارش

اب آخر میں اپنی قوم کے تمام دانشوروں ، مفکّروں ، شاعروں ، ادیبوں ، خطیبوں ، صحافیوں اور عالموں سے گزارش کروں گا کہ ربِّ کریم نے ان کو فکر و نظر ، ذکاوت و فراست ، لطافت تحریر و قوّت تسخیر اور طلافت لسانی و سحر آفرینی کی جو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے اس کو غیر ضروری کاموں میں نہ لگائیں بلکہ بے پناہ قوّت و عزم کے ساتھ دین الٰہی کی سچی خدمت کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور قریہ قریہ ، بستی بستی ، صحرا صحرا ، گوشہ گوشہ اور محفل محفل ۔۔۔ المختصر ۔۔۔ ہر ایمان والے مردوں اور عورتوں کے دِلوں میں اپنی تحریر و تقریر

اور نثر و نظم کے ذریعہ اس خیال کو لازوال عزم اور غیر متبدل ارادے کے رنگ و روپ میں راسخ سے راسخ تر کر دیں کہ وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک اپنے کسی ایسے نزاعی معاملے کو کسی غیر اسلامی عدالت میں نہیں لے جائیں گے جو اپنے ملک کی دستور کی روشنی میں غیر اسلامی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو ۔۔۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غیر جمہوری اقدامات کے خلاف شور و غل نہ مچایا جائے ۔ کانفرنسیں نہ منعقد کی جائیں ۔ جلسہ و جلوس کے ذریعہ پرامن مظاہرے نہ کئے جائیں اور تجویزیں پاس کرا کے ایوان اقتدار تک نہ پہونچائی جائیں ۔ بلکہ ۔۔۔ میں صرف یہ کہتا ہوں یہ سب کچھ کیا جائے مگر اسی کو اپنے دکھ درد کا حقیقی علاج نہ تصور کیا جائے ۔۔۔ ہمارا علاج تو اسی طرزِ عمل میں ہے جس کا ذکر ابھی میں اوپر کر چکا ہوں ۔ یہ علاج بے ضرر بھی ہے اور پُرامن بھی نیز اسلامی اقدار کی حفاظت کا مؤثر و کامیاب ذریعہ بھی ۔۔۔۔ اس کے برخلاف یہ شور و غل والا راستہ تو اس راہ پر چلنے والوں کی ناکامی بار بار دیکھی جا چکی ہے لہٰذا کسی حال میں بھی لازمی طور پر اس کے سود مند ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ۔ الحاصل شرعی عدالت ہی کے ذریعہ ایک مسلمان اپنے اسلامی فکر و عمل کی کماحقہ نگہداشت کر سکتا ہے ۔ لہٰذا ۔ ہندوستان میں بسنے والے تمام برادران اسلام سے میری گزارش ہے کہ وہ اِس نازک دور کی نزاکت کو محسوس فرمائیں اور جس طرح وہ بے شمار دینی مدارس و مکاتب کی سرپرستی فرما کر علم دین مصطفیٰ کی خدمت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اُسی طرح ہر ہر شہر میں اور مسلمانوں کی ہر ہر بستی میں ۔یا۔ کم از کم درجے میں ہر اس جگہ جسے شرعی نقطۂ نظر سے مصر کہا جا سکے ایک ادارہ بنام شرعی عدالت ۔یا۔ دار القضاء قائم کریں اور اس میں قضاء و افتاء میں مہارت کاملہ رکھنے والے علماء کی خدمات حاصل کریں اور ان علماء کو معاشی و اقتصادی طور پر بالکل مطمئن کر دیں تاکہ وہ ہر چیز سے بے فکر ہو کر صرف قضاء و افتاء کے کام میں ہمہ تن مشغول رہیں ۔۔۔۔ اگر ہر ہر بستی میں شرعی عدالت کا قیام مشکل نظر آئے تو اتنا تو فوری طور پر ہو ہی سکتا ہے کہ جتنے دینی مدارس ہیں ان میں شرعی عدالت (دار القضاء) کا ایک شعبہ لازمی طور پر رکھا جائے جہاں ہر مسلمان آکر اپنے نزاعی معاملات میں کتاب و سُنّت کی ہدایات کی روشنی میں اپنا فیصلہ حاصل کرے ۔ ادارہ شرعیہ

بہار کے زیرِ اہتمام پٹنہ میں جو دارالقضاء قائم کیا گیا ہے اور اس نے ملک کے طول و عرض میں جو خدمات انجام دی ہیں اور نکاح و طلاق اور دوسرے نزاعی معاملات سے متعلق جو فیصلے دیئے ہیں اور اس سے بے شمار مُسلم گھرانوں کو جو فائدے پہونچے ہیں وہ بے حد قابلِ تعریف ہیں ـــــ اس دور میں اس طرح کے دارالقضاء ہماری اسلامی زندگی کی اہم ضرورت بن گئے ہیں ـــــ ویسے بھی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ غیر اسلامی حکومت میں کتاب و سُنّت کی ہدایات کی روشنی میں اُن کے تمام فیصلے نہ ہو سکنے کی صورت میں وہ خود ایک شرعی والی کا انتخاب کر لیں اور کتاب و سُنّت کی روشنی میں کئے ہوئے اس کے سارے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں ـــــ

اس لئے کہ ـــ اذا خلا الزمان عن سلطان ذی کفایۃ فالامور موکلۃ الی العلماء ـــ جب زمانہ ایسے سُلطان سے خالی ہو جو (شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرنے میں) اپنے غیر سے بے نیاز کر دینے والا ہو تو جملہ شرعی معاملات علماء کے سُپرد کر دیئے جائیں گے اور اُنھیں کے شرعی فیصلوں کو واجب العمل سمجھا جائے گا ـ مثال کے طور پر ـــ بوہرہ جماعت کو لیجئے ـ وہ پیدا ہونے سے لے کر مرتے دم تک اپنے کسی بھی مذہبی مسئلے کو لے کر کسی بھی عدالت میں نہیں جاتے ـ بلکہ اُنھوں نے اپنے "سیدنا" کو سپریم اتھارٹی مان کر ان کے نائبین ـ یا ـ مقرر کردہ افراد سے ہی اپنے شرعی معاملات حل کرا لیتے ہیں ـ تو اب اگر بالفرض دستورِ ہند سے جمہوریت و سیکولرزم کا ستیا ناس بھی ہو جائے جب بھی اس قوم پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ؟ ـــــ اسی طرح ـــ اگر سارے مسلمان یہ طے کر لیں کہ ہم اپنے نزاعی معاملات کا تصفیہ اپنے ہی دارالقضاء سے کرائیں گے اور کتاب و سُنّت کی روشنی میں جو فیصلہ ہو گیا اسی پر لبیک و سعدیک کہیں گے تو ایسا کیوں نہیں ہو سکتا ؟ ـــ بلکہ ـ میں تو کہتا ہوں کہ اس صورت میں اگر پورے دستور کو غیر جمہوری بنا دیا جائے جب بھی مسلمان مکمل اسلامی فکر و عمل کے ساتھ شاہراہِ حیات پر رواں دواں نظر آئے گا ـ و آخر دعوانا اَنِ الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین ـ